ڈیڈیکیشن

اپنے دو عزیز دوستوں

یعنی

جناب حبیب الرحمٰن خاں صاحب حسرت شروانی رئیس بھیکم پور

سیکرٹری "انجمن ترقی اردو"

اور

میر نیرنگ بی - اے وکیل انبالہ

کے نام

ا کی مبالغہ آمیز ستائشوں نے ان قصوں کے لکھنے یا تلخیص کرنیکی ہمت دلائی

میں

بغیر ان کی اجازت کے ان اوراق کو

معنون کرتا ہوں

سجاد

یہ فسانے کچھ طبعزاد ہیں، کچھ ترکی و انگریزی سے مقتبس

خارستان و گلستان صحبتِ ناجنس نکاحِ ثانی سودائے سنگین	ترکی سے لئے گئے ہیں مگر ان میں بہت کچھ تصرف کیا ہے۔
مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ	انگریزی کے ایک مضمون کا چربہ ہے
ازدواجِ محبت چڑیا چڑے کی کہانی حضرتِ دل کی سوانح عمری حکایۂ لیلیٰ و مجنوں حبِّ وطن (وغیرہ وغیرہ)	میرے ہی ناکارہ تخیل کا نتیجہ ہیں۔

سجاد حیدر

ج

فہرست مضامینِ خیالستان

صفحہ

خیالستان

تمہید

ان چند سطروں کے لکھنے کا مقصد نہ تقریظ ہے نہ تنقید بلکہ اس کا مطلب ہے محض ایک تمہید۔

آج اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ناظرین سے سید سجاد حیدر صاحب کی تقریب کی جائے۔ سید صاحب موصوف کا نام دلدادگانِ فنِ ادب کے لئے نیا نام نہیں ہے۔ میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اس مجموعے کے مُدعائے اشاعت کے متعلق چند ضروری باتیں درج کردوں۔

یہ تحریریں مختلف موقعوں پہ مختلف رسالوں میں (زیادہ تر مخزن میں) شائع ہوکر قبولِ عام کا (شاید یہ کہنا زیادہ درست

ہوگا کہ قبولِ خواص کا) تمغا حاصل کر چکی ہیں۔ سیّد صاحب میرے حال پر خاص التفات فرماتے ہیں۔ اُن اختصاص کی وجہ سے مَیں نے اصرار کیا کہ ان تحریروں کا رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہونا (اور وُہ بھی لباً اوقات بہ اقساط) ان کے لئے کافی انصاف نہیں ہے۔ مَیں نے کئی دفعہ یہ گذارش کیا کہ ان تحریروں کو ایک مجموعے کی شکل دیجائے تاکہ خیالات کی ان بولتی چالتی تصویروں کا ایک مرقّع مرتب ہوجائے۔ اور "حکایۂ لیلےٰ و مجنوں" جیسے دلچسپ مضامین ناظرین تک دست و پا بُریدہ حالت میں نہ پہنچیں۔

مَیں خوش ہُوں کہ میرے متواتر تقاضے نے آخر اثر کیا اور سیّد صاحب نے یہ مجموعہ چھپوا دیا۔

اِس گئے گذرے زمانے میں بھی اُردو فنِ ادب کے خیر اندیشوں اور خادموں کی تعداد (بحمداللہ) معقول ہے اور جس کسی کو

بھی اس معاملے سے کچھ دلچسپی ہے تو یہ ایک گونہ خوشی ہو

کہ طرزِ خیال اور اندازِ بیان کی توسیع کی کوششیں مختلف سمتوں

میں عملی تدریج مراتب ہو رہی ہیں۔ میں پرانے رنگ کا قدر شناس

نہیں ہوں۔ لیکن ان لوگوں میں سے ضرور ہوں جو یہ چاہتے ہیں

کہ نئے طرزِ خیال سے نئے اندازِ بیان ایجاد ہوں تو

جدت کو بدعت (اور وہ بھی بدعتِ سیئہ) نہ سمجھا جائے۔

نظم کے جذبات جن کی اصلیت سے ماضی کے شعراء و متغزلین بسا اوقات

دور جا پڑتے ہیں۔ نظم و نثر میں سچائی کے ساتھ ظاہر ہوں۔

لفظی ٹیپ ٹاپ کو بجائے خود مدعا نہ بنا لیا جائے۔ الغرض

حسنِ بیان نہ صرف قائم ہی رہے بلکہ ترقی کرے۔ اس ترقی میں

رنگا رنگی اور تنوع کو شامل سمجھا جائے اور ساتھ ہی حسنِ خیال کو

حسنِ بیان کی جان قرار دیا جائے۔

ان کوششوں میں سید سجاد حیدر بھی شریک ہوئے ہیں۔

شاہدِ رعنائے سخن کے شیدائوں میں وُہ کسی سے پیچھے نہیں آگے ہی ہیں لیکن وُہ عاشق بھی ہیں اور مشاطہ بھی۔ وُہ اسباب حُسنِ یار کے بڑھانے میں کہاں تک کامیاب ہُوئے ہیں؟ اسکا جواب مخزن کے اُن ناظرین سے پُوچھئے جو اہلِ نظر اور صاحب طبیعت ہیں۔ اُن کے اندازِ بیان میں کہیں کہیں تو انگریزیت کی جھلک ہے اور کہیں کہیں غالباً تُرکی طرزِ بیان کا چربہ ہے مگر داد کے قابل یہ بات ہے کہ انگریزی اور تُرکی کی یہ تقلید عملی طور پر ایجاد کا حکم رکھتی ہے۔ کیونکہ وُہ غیر مانوس اور ناخوش گوار نہیں ہونے پاتی۔ اس میں انوکھاپن ہوتا ہے۔ مگر اجنبیت نہیں ہوتی۔

علاوہ اس کے ان تحریروں میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ وُہ صرف پُرمعنی ہی نہیں بلکہ معنی خیز ہیں۔ صرف معنی خیز ہی نہیں بلکہ خیال انگیز ہیں۔ گویا یہ خیالات ہی نہیں ہیں بلکہ

خیالات کے تخم بھی ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس لحاظ سے "خیابستان" ناموزون نام نہیں ہے۔ یہ نام میں نے ہی تجویز کیا تھا اور میں خوش ہوں کہ یہ خیالستان خیابستان ہی کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

انبالہ
۶۔ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء

نیرنگ



خارستان و گلستان

{۱}

گلستان

آج سے دس ہزار برس قبل کا ماجرا ہے۔ بحرِ ہند میں ایک جزیرہ تھا جو اب ناپید ہے۔ چاندنی رات تھی، سطحِ آب پر سکونِ مطلق طاری تھا، اور اس سکون پر چاند اپنی شعاعیں ڈال رہا تھا۔ فضا میں خاموشی، بے پایاں سمندر، ڈراونی تنہائی، وحشت انگیز سکوت کوئی صدا نہیں، کوئی اثرِ حیات نہیں۔ ایک غیر محدود

مگر روشن تنہائی ، ایک محشرِ سکون ! یہ عالم ہے ۔ چاند خاموشی کے ساتھ گویا سوچ رہا ہے ، موجیں بھی سوچ رہی ہیں ؛ چاند کی کرنوں کے سیلان سے بچا ہوا سایہ سوچ رہا ہے ، بادلوں کے منتشر ٹکڑے سوچ رہے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا، اِس خاموشی کا بھید چپکے چپکے سمندر کے کان میں کہنا چاہتی ہے اور نہیں کہہ سکتی ؛ سمندر کا سینہ سانس لینے کی کوشش کرنا چاہتا ہے ، تمام موجودات میں گویا ایک کروٹ لینے کی خواہش معلوم ہوتی ہے ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے پایانِ ہستی اور سکوت میں اگر کہیں سے ذراسی صدا بھی آجائے تو دُنیا ہنس پڑیگی ، اُچھل پڑیگی ۔

نسرینِ نوش جزیرے کے دامن میں ، سمندر کے ریت پر ایک سروِ زرّین کی طرح جو زمین پر گر پڑا ہو لیٹی ہوئی تھی ، کہ موجوں میں کچھ حرکت پیدا ہوئی ؛ اور وہ نسرینِ نوش کے عریاں

جسم، چاند جیسے عُریاں جسم پر، گردن پر، بالوں میں سے گذرنے لگیں۔ ادھر سلسبیل قمر اُس کے بدن پر پڑ رہی تھی، اُدھر چھوٹی چھوٹی مَوجیں ایک دُوسرے کو ہٹاتی آتی تھیں اور اُس سیمیں تن کے کبھی بالوں میں سے گذرتی تھیں، کبھی اُس کے گورے بازوؤں سے لپٹی تھیں، کبھی اُس کے بلورین سینہ سے ملابست کرتی تھیں، کبھی اُس کے ارغوانی پاؤں کو سہلاتی تھیں، اور اس کے بوسے لے لے کر آگے چلی جاتی تھیں، اور پھر لَوٹ کر آتی تھیں اور قعرِ بحر سے موتی لا لا کر اُس کے پاؤں پر نثار کر کے نہایت تعظیم اور احترام کے ساتھ واپس جاتی تھیں۔

نسرین نوش ایک پُر لطف تھکن سے، ایک بیہوش نشے سے آہستہ آہستہ بیدار ہُوئی؛ اس کے چاروں طرف جو پریاں ایک ہالہ بنائے کھڑی تھیں۔ اُن پر نظر ڈالی، اور اپنے لعل

لبوں سے برقِ تبسّم گرا کے کہا: "میری بیٹھی ملو" اس پر چند خدام تعمیل حکم میں مصروف ہوئیں، اور اس کے بعد چند اور پریاں جو ریشمی تولیا، چادر وغیرہ لئے کھڑی تھیں، اُنہوں نے اُس کے بازوؤں، سینے، اور پاؤں کو پونچھنا اور بالوں کو سکھانا شروع کیا۔ نسرین نوش اس شاہراہ زرین کو جو چاند نے اس تک بنا رکھی تھی، دیکھنے اور موجوں کی ارگن کو سُننے لگی۔

اتنے میں ایک قسم کی چھوٹی پریاں، صدف بحر کی بنی ہوئی نفیریاں، اور دف اور سارنگی اور ستار غرضیکہ پورا ساز لئے ہوئے، نسرین نوش کے گرد اُڑنے اور ستار بجانے لگیں۔ نسرین نوش اُٹھ کھڑی ہوئی اور ماہتاب کی طرف ہاتھ بڑھا کے اس رات کے لئے اُسے "خدا حافظ" کہا اور اپنی سہیلیوں کے کبھی کندھوں پر ہاتھ رکھ کے، کبھی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے، پھولوں سے چھپے ہوئے راستے پر نسیم کی طرح خرامِ ناز سے چلنا شروع کیا۔

اس وقت پھول جھک جھک کے اُسے سلام کرتے تھے، اور ایک دوسرے سے بلکر گویا تالیاں بجاتے تھے۔ بنفشہ اُس کے پاؤں چومنے اور روندے جانے کی تمنا سے سینہ میں اپڑاتا تھا۔ نسرین نوش پانچ منٹ تک چلی ہوگی کہ ایک کاشانۂ بلور میں داخل ہوئی۔

چاند کا عکس اس محل کی کل دیواروں، اور صحن کے فوارے پر پڑتا تھا، اور اس فوارۂ نور سے ایک زمزمۂ روح نواز پیدا ہو رہا تھا۔ حوض کے کنارے نیبو، نارنگی، ترنج کے پودے پھولوں سے لدے ہوئے دماغ کو فرحت دے رہے تھے یہ سب ایک دسترخوان پر بیٹھ گئیں، زبرجد کے طباقوں میں طرح طرح کے کھانے اور میوے، اَنناس، کیلے، خرمے، انار، انگور، سیب، شکار کے گوشت، مچھلیاں، لائی گئیں۔ لالے کے پیالوں میں شراب، شربت، گلاب پئے گئے۔

حوض کے دُوسری طرف، ناچنے والیوں، گانے والیوں، نے ایک حلقہ باندھا اور رباب، مزمار، بربط، ستار پر نسرین نوش کی حُسن و ادا کی تعریف میں قصیدے، غزلیں، ٹُھمریاں گانی شروع کیں، گانا بھی وُہ گانا جو ایک جوئے رواں کی طرح مسلسل تھا۔

اِدھر سہیلیوں نے چھیڑ خانی شروع کی، رفتہ رفتہ لالوں، اور اور پھُولوں کو پھینک کے لڑائی شروع ہُوئی، اور تھوڑی دیر میں پھُولوں سے زخم کھا کھا کے پریاں گرنے لگیں۔

لذیذ شراب کے نشہ سے، نسرین نوش ہنستی ہُوئی ایک سہیلی کی گود میں گر پڑی، اور اپنے ہونٹ چُوس چُوس کر نظر اِس طرح دُور دُور ڈالنے لگی۔ گویا عالمِ خیال میں ہے۔ سہیلیاں اپنی مالکہ کے ہاتھ چُوم چُوم کے، اِس کی بالوں کی خوشبُو سے دماغ مُعطّر کر کر کے، شراب کا ایک ایک گھونٹ پیتی تھیں۔

نشہ کا خمار چڑھنا شروع ہُوا تھا کہ ناچنے والیوں کو پھر حکم ہُوا،

سازِ پریوں کا ایک خاص ناچ، ایک رقیق، نازک،
نُورانی ناچ ناچا گیا۔
وُہ گلابی، چمپئی، دھانی ریشمی ساڑھیاں جو پریوں کے سڈول
جسموں سے لپٹی ہُوئی تھیں، وُہ اِس ناچ کے چکّروں میں طرح طرح
طرح کے نئے رنگ پیدا کرتی تھیں، پریاں تیتری کی ہلکی پرواز
کی طرح اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ٹھمک ٹھمک کے
آتی جاتی تھیں، کبھی دو ایک دُوسرے سے ملیں کبھی علیٰحدہ
ہوجائیں کبھی دو کے درمیان میں سے تیسری گذر جائے
کبھی حلقہ بندھ جائے کبھی ٹوٹ جائے۔ اِس ملنے،
جُدا ہونے چکّر کھانے سے رنگ اور نُور کا اِنحلال اور اجتماع
ایسا مختلف ہوتا جیسے ہشت پہلو شیشے میں سے آفتاب کی کرنیں
گذر رہی ہوں۔ ان پریوں کا تھرک تھرک کے ہلنا، پھر تتّر بتّر
ہوجانا، شانوں کا ہلنا، بالوں کا بحرِ سنبل کی طرح لہرانا، نازک

کمروں کا لچکے کھانا، جھک جھک کے دُہرا ہو جانا، یہ سب باتیں سلیس و بلیغ گفتو سے (جو سازندے بیان بجا رہی تھیں) بلکہ ایک ایسا نشہ آور منظر پیش کرتی تھیں کہ کان موسیقی اور رقص میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور آنکھ نہیں بتا سکتی تھی کہ آیا موسیقی رقص کر رہی ہے، یا رقص نغمہ سازی، کیا ہو رہا ہے۔

نسرین نوش ان تمام متوجات رقص و آہنگ کو، ایک سہیلی، صبح خنداں کے زانو پر سر رکھے ہوئے ایک بے پروا، لاابالیانہ نگاہ سے دیکھ رہی تھی، اور ایسا نظر آتا تھا کہ وہ اِن چیزوں کی طرف زیادہ ملتفت نہیں، کیونکہ اُس کی نگاہ کسی دور نقطہ پر گڑی ہوئی تھی۔

یہ ٹیپ ٹاپ، یہ ناچ گانا، وہ رات دِن دیکھتی تھی، اس لئے اُس کی رُوح خفتہ کو جگانے یا اُس کی دِل میں حرکت پیدا کرنے کے لئے یہ کافی نہ تھے۔

اس رات محل میں داخل ہونے کو اس کا دل نہ چاہا۔ اسکی

طبیعت میں چاند کو دیکھ دیکھ کر یہ اُمنگ پیدا ہوتی تھی، کہ اس
کے عُریاں جسم سے جا کر لپٹ جائے۔ وُہ اُسے ٹکٹکی باندھے
دیکھ رہی تھی، سہیلیوں نے، اس کی طبیعت بہلانے کے
لئے لطیفے، کہاوتیں، بُوجھ پہیلیاں کہنی شروع کیں، کہ چاند
اور سُورج میں کیسی دوستی ہے، شہد کی مکھیاں، پھولوں سے
کیا کہا کرتی ہیں، بھونرا، چنبیلی کے کان میں کیا بھنبھنایا
کرتا ہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اُن نُورانی آنکھوں میں
نیند آنی شروع ہُوئی، اس کے نرم جسم کو سہلا سہلا کے، اُس کے
دماغ کو تھپکا تھپکا کر، ہلکے بادلوں کے نیچے بھاگتے ہُوئے
چاند کو پیشِ نظر کر کے غرضکہ عجب عجب دھوکے دے دے
کے، نیند اس کی آنکھوں میں چپکے سے آگئی اور اُن گھنی پلکوں
کو ملا دیا۔

نسرین نوش کا پینڈ میں جانا تھا، کہ ناچ بند کر دیا گیا، لطیفے

سہیلیاں ختم ہوگئیں۔ نہ صرف یہ بلکہ فوارے بند ہوگئے، وہ عندلیب جو پنجرے میں بند بیٹھی گا رہی تھی، چُپ ہوگئی، ہوا کی سنسناہٹ بند ہوگئی، تاکہ نسرین نوش آرام سے سوئے تمام رامشگر پریاں، سہیلیاں، دبے پاؤں علیحدہ ہوگئیں گھونگرو آہستہ آہستہ اُتار ڈالے گئے۔ اتنے میں سفید بازوؤں والی چھوٹی چھوٹی پریاں حلقہ باندھ کے آئیں، اور نسرین نوش کے گرد اُڑنے لگیں۔ اُن کے پروں سے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ یہ پریاں نسرین نوش کی نگہبان تھیں۔

دو تین منٹ کے بعد ایک بڑھیا درختوں میں سے نکل کے جریب ٹیکتی ہوئی آہستہ آہستہ نسرین نوش کے پاس آئی اور نسرین نوش کے بدن پر جو چادر ڈالدی گئی تھی، اُسے چہرے پر سے ہٹا کر، غور سے دیکھنے لگی۔ اُس کے سوکھے چہرے پر آثارِ خوشی ظاہر ہوئے، اور "الحمد للہ" کہہ کے جیسی آئی تھی

ویسی ہی غائب ہوگئی۔

یہ نسرین نوش کی ماں تھی۔ اپنی لڑکی کو نہایت احتیاط اور بدگمانی سے رکھتی تھی، اور اس طرح ہر شام کو آکر تحقیقات کرتی تھی۔

یہ معمر عورت سوچا کرتی تھی کہ: "میرے بالوں کو سفید کرنے والے، میرے دانتوں کو گرانے والے، میرے چہرے کو خراب کرنے والے یہ مرد ہی تو ہیں، ان کے ظلم ہی تو ہیں؛ اپنی اولاد کو میں ان مصیبتوں سے بچاؤنگی۔ اسی لئے میں اس لڑکی کو اس جزیرے میں لائی ہوں۔ اُسے کھیل تماشے، دل بہلاوے ہنسی دل لگی، آرائش و نمائش سب کچھ دونگی، لیکن مرد کیا شئے ہے، یہ نہ جاننے دونگی۔ وہ فلاکت جس کا نام مرد ہے، اُسے اِس کے قریب نہ آنے دونگی؛ لیکن اگر ڈر ہے تو اتنا کہ مجھے اطلاع ہوئے بغیر اس جزیرے میں کوئی مرد آجائے؛

بہر حال اس وقت تو میری کل تدبیریں مکمل ہیں اور میرے دل کو اطمینان ہے۔

ماہتاب، دھیما ہوتے ہوتے، غائب ہو گیا، مگر نسرین نوش کے جسمِ نازک کو تو طلوعِ آفتاب کے سپرد کرتا گیا۔ سفید بازوؤں والی نگہبان پریاں ہٹ گئیں، اور ان کے بجائے سہیلیاں اور گانے والیاں آ گئیں، جنھوں نے نرم و نازک آواز سے اُسے جگانے کے لئے پیاری پیاری راگنیاں گانا شروع کیں۔ تھوڑی دیر میں، نسرین نوش نے اپنی مخمور آنکھیں کھولدیں، اور انگڑائیاں لیتی ہوئی، اور اپنے پریشان بالوں کو سنوارتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ پھر ایک صاف شفاف نہر کے کنارے، نیلوفر کے پھولوں کی ایک چوکی پر جا کر بیٹھ گئی؛ پریاں بھی آکر اُس کے گرد جمع ہو گئیں۔

مشّاطہ پریوں نے نسرین نوش کا سنگار کیا، نسرین نوش

نہر کے صاف پانی میں اپنے عکس جمال کو دیکھ رہی تھی۔ تیتریاں ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی اُڑ رہی تھیں ؛ نہر کی روانی سے نرم صدا پیدا ہو رہی تھی، سہیلیوں نے پھر ہنسی کی باتیں شروع کیں، جنکو سُن سُن کر وہ پیارے باریک ہونٹ تبسم میں کھُل کھُل جاتے تھے۔

سہیلیوں اور خادمہ پریوں کے نام، گل چکان، زہرہ جبین ناز آفریں، موجِ نور، بعضوں کے نام پھولوں پر مثلاً نیلوفر، سوسن وغیرہ، بعضوں کے پرندوں کے اُوپر، مثلاً طاوس حرام کبک ادا وغیرہ وغیرہ تھے ؛ اور ان سب کے نام اور عنوان کے مناسب انکا لباس تھا۔

سنگار کے بعد، اس صبح کے لئے ایک خاص رنگ کا لباس پہنکر، نسرین نوش نیلوفر کے پتوں کی کشتی میں بیٹھ کر سہیلیوں کے ساتھ تھوڑی دُور تک نہر میں گئی ؛ پھر یہ سب کنارے پر پہنچیں،

جہاں بلّور اور پھولوں کی ایک بگھی تیار کھڑی تھی، اس بگھی میں دو مادہ سیمرغ جُتی ہوئی تھیں، اور اس انتظار میں کہ انکی مالکہ بگھی پر سوار ہو گی، آمادہ روانگی کھڑی تھیں، جوئے رواں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نسرین نوش گاڑی میں سوار ہوئی، اور جوئے رواں کو اپنے پاس بٹھا کر، "دیارِ گل" کو چلنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے سنتے ہی، چند چھوٹی چھوٹی پریوں نے، جو چھوٹے چھوٹے بگل لئے کھڑی تھیں، کوچ کا بگل بجایا، اور اس تزک و احتشام کے ساتھ سواری روانہ ہوئی۔ سامنے طاؤس، کبوتر، قمریاں، طوطی، ناچتے، ہوا میں اڑان بھرتے، گاتے چہچہاتے اور طرح طرح کے تماشے کرتے جاتے تھے۔

سڑک پر پھول کی پتیاں، گلال، اور چاندی کے ذرّے بکھرے ہوئے تھے، جو پہیوں کے چلنے سے اُڑ اُڑ کر، گاڑی کے بلّوریں پہیوں میں، پرندوں کے پروں میں

جم جاتے تھے، اور اس سارے قافلے پر قوس قزح کا رنگ پیدا ہو جاتا تھا۔

آفتاب، اُفق سے اپنے نُورانی بالوں کو سنوارتا ہُوا، کچھ اونچا ہوا تھا کہ یہ قافلہ اس بلدۂ شعر و خیال میں جسے نسرین نوش نے "دیارِ گل" کہا تھا پہنچا۔ یہاں کی وادی حقیقتاً وادیٔ گل تھی۔ نسرین نوش کی تشریف آوری کی خوشی میں، تمام غنچے ایک دم کھل گئے، اور انکی خوشبو نکل نکل کے اُس کے جسم کو، کندھوں کو، چہرے کو احاطہ کر کے چومنے لگی، نسرین نوش گاڑی سے اُتری؛ اتنے میں سہیلیاں، نوکرنیاں، اور سازندے وغیرہ بھی پہنچ گئیں۔

اب نسرین نوش نے اِس زمان و مکانِ لطافت میں آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ سہیلیاں تعظیم اور احترام کے انداز سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اُونچے درخت بھی

اِس ملکۂ ملاحت کے سامنے جھک جھک کر اسکی خدمت میں
پھول پیشکش کرتے تھے اور نسرین نوش اُن پھولوں کو اپنے
اُن پیارے ہاتھوں سے (جن میں اَور پھولوں میں صرف اسقدر
فرق تھا، کہ یہ پھولوں سے زیادہ خوبصورت تھے) چھو چھو کر،
سہیلیوں کو ایک عظمت آمیز نیم غمزہ سے حکم کرتی تھی کہ
اِنہیں توڑو"۔ زہرہ جبین گل چکاں کی گود ان پھولوں سے
بھر گئی۔ ان پھولوں کا ایک تاج بنایا گیا جسے نسرین نوش
نے پہنا، غرضکہ اس طرح، نسیم صبح کے ساتھ، اور نسیم صبح
کی مانند سب آہستہ آہستہ چل کے ایک اُونچے موقع پر پہنچیں جو
مطلع آفتاب کے مقابل تھا، نسرین نوش کھڑی ہو کر آفتاب
کی طرف جُھکی اور پھر سیدھی ہو گئی، زاں بعد اپنے ہاتھ کو چوم کر،
گویا سُورج کو ایک بوسہ بھیجا۔ یہ ایک آئین آفتاب پرستی تھا۔
اس بوسہ کے بھیجتے ہی، سہیلیاں ہنس ہنس کے دوڑ دوڑ

کے، ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کے، بالوں میں پھول
لگا لگا کے، ہاتھوں میں پھولوں کے پنکھے ہلا ہلا کے، ناک
کروں کو بل دے دے کر، آنکھوں کو شرارت سے پھرا پھرا کے،
نسرینِ نوش کے گرد چکر لگانے لگیں. پھر کھڑی ہو کر آفتاب
کی شان میں گانے گانے لگیں. پھر ان سب نے ہاتھوں
میں ہاتھ ڈال کر، کبھی ہوا میں اُڑ کر، کبھی زمین پر پاؤں مار کے
آفتاب کے لئے ایک مستانہ ناچ ناچا، اور ایک دِلرُبا گانا
گایا. اس گلبانگ رقص و آہنگ کی لطافت میں درخت بھی
جھوم جھوم کے نسیم آہستہ آہستہ چل کے شریک ہوئی. پھول،
درخت، ہوا، سب حالتِ وجد میں آگئے.

نسرینِ نوش اس نشۂ شعر کی کیفیت سے لذت یاب
معلوم ہوتی تھی اور اس آئینِ آفتاب پرستی میں دل سے شریک
تھی. اخیر میں اس کو ختم کیا لیکن پھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکے

ختم کرنے پر پریاں دل سے راضی نہیں تھیں، کیونکہ آئین ختم ہوتے ہی، درختوں کی شاخوں میں پھولوں کے بنے ہوئے جھولے ڈالے، اور اُڑ اُڑ کے ایک جھولے سے دُوسرے جھولے پر جانا، جھولنا، ہنسنا اور کودنا اُچھلنا شروع کیا، ایک مدّت تک اس طریقہ سے وقت گزرا۔

آخر کار نسرین نوش پھر گاڑی پر سوار ہوئی، اور اُسی انتظام کے ساتھ واپس ہوکر کاشانۂ بلّور میں جو دسترخوان کھانوں سے حاضر تھا اُس پر معہ سہیلیوں کے بیٹھی۔

غرضکہ دن اس طرح گزرتے تھے۔ اکثر نسرین نوش صبح کے کھانے کے بعد قیلُولہ کرتی تھی، اور تیسرے پہر کو شکار کے لئے نکلتی تھی۔ نازک پیارے ہاتھوں میں تیر کمان لیکر کبھی کبھی مشق تیر اندازی کرتی تھی۔ کبھی غروب آفتاب کے قریب ساحل بحر غسل کے لئے جاتی تھی، اور تیر اندازی کے

بعد تھکن اُتارنے کے لئے، گلاب یا بنفشہ کا اُبٹنا مل کے
سمندر میں نہاتی تھی، رات کو سہیلیوں کو بُلا کے گانا ،
پہیلیاں کہانی وغیرہ سے دِل بہلاتی تھی۔ کبھی کوئی بحث
شروع ہوجاتی، اور یہ زمزمۂ مکالمہ کبھی پُرحدّت ہوجاتا،
گویا ایک منبعِ شفاف سے پانی گِر رہا ہے، کبھی تیز اور
بلند قہقہہ کی آواز آتی، گویا ساز زور سے بجا، کبھی آہستہ
آہستہ باتیں ہوتے ہوتے خاموشی طاری ہوجاتی، گویا،
بادِ نسیم پھولوں میں ہلکے ہلکے چل کے رُک گئی۔ چاندنی
رات ہوتی تو ایک دو سہیلیاں ساتھ لیکر سیر کو نکل جاتی،
اسوقت نسرین نوش کا چلنا، اس نہر کے پانی کی مانند
ہوتا تھا جو بلّور کی زمین پر بہہ رہی ہو، اور جس کے پانی
کو معطّر نسیم جُنبش دے رہی ہو، جس کے کنارے پھول
کھلے ہوں اور بلبلیں اُڑ رہی ہوں۔

نسرین نوش پانچ برس کی تھی جب اس جزیرہ میں پہلے پہل آئی تیرہ برس سے اسی طرح، خوشبوؤں میں، آرام میں، نازونعم میں، بیفکریوں میں، لاڈ اور پیار میں زندگی بسر کر رہی ہے، اور مجہول غیر مجسّم خیالات میں مستغرق رہکر، دن ہنسی کے ساتھ، اور رات متبسّم خواب میں گذارتی ہے۔

لیکن ایک صبح خلافِ معمول اُس کے دل میں ایک جلن محسوس ہوئی۔ اُٹھی، کاشانہ بلّور کے قریب جو نہر بہتی تھی اُس تک گئی اور نہر کے اندر جاکر لیٹ گئی اور دیر تک اُس میں بیحرکت پڑی رہی پھر نکل کے اور بدن کو سُکھا کے، سفید ریشمی بستر پر جا لیٹی۔

نسرین نوش پر ایک سخت نیند غالب ہوئی، اور وُہ شام تک سوتی رہی یہانتک کہ سُورج ڈھلا، سُورج کی شعاعیں اس پر آکر پڑیں اور وُہ جاگی۔ اسوقت اُس کی طبیعت ایک ایسی شے چاہتی تھی، ایک ایسی مُبہم وجُود کی آرزو کر رہی تھی جو اس کے بازو و دل

کو پکڑے کمر کو سنبھالے، اس کے جسم کو اٹھالے ۔ ایک غیر معنی تمنا اس کے دل میں پیدا ہو رہی تھی ، اور اس کا دل چاہتا تھا کہ ایک ذات ، ایک وجود آئے ، جو اس پر قادر ہو ، جو اس پر حاوی ہو ۔

اس نے دیکھا کہ اُس کے پاس ایک سفید براق ہنس پھر رہا ہے ۔ اُسے ہی اُس نے گود میں لے لیا ، اور اُس کے سفید سینے کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگالیا ۔ اور اُس کی گردن کو اپنی گردن سے ملادیا ۔ اور اپنی تمام قوت سے اُسے بھینچنا شروع کیا ۔ اور اس طرح پرند کے نرم پروں میں اپنی آنکھوں کو کچھ کھولے ، کچھ بند کئے ، بدن کو جھکائے دیر تک بے حرکت پڑی رہی ۔

نسرین نوش ، ان خوشبوؤں سے ، ان رنگوں سے ، ان پھولوں سے ، ان کھیل تماشوں سے ، اُکتا گئی تھی اور ان سے

چھٹکارا چاہتی تھی۔

اب پھولوں کا اس پر نثار ہونا، اس کی روح کو مشغول نہ کرتا تھا۔ ناچنے والیوں کے ناچ، اور عشوے اور غمزے اس کے دل کو نہ بہلاتے تھے، سہیلیوں کا اس کے بدن کو ملنا، اسے آرام نہ دیتا تھا۔ وہ ایک شے تلاش کرتی تھی جسے وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا ہوگی کیا نہ ہوگی، ایک مبہم چیز چاہتی تھی جو اسے دکھ دے، اس کے دل میں درد پیدا کرے، احساس پیدا کرے، اسے مسل ڈالے۔ ایک ایسی پُرقوت، پُرجرأت شے کہ باوجود اس کے حسن و جمال کے، باوجود اس کے کہ وہ جزیرے کی ملکہ تھی، اس سے نہ دبے، اس کے رعب میں نہ آئے، بلکہ اسے پکڑے، اسے مارے، ٹکڑے کر ڈالے۔

(۲)

خارستان

تاڑ، برگد، سال، چیڑ اور ببول وغیرہ درختوں کے ایک اصلی اور قدیم جنگل میں، سوکھے پتّوں پر درندوں کے چلنے کی آواز، بیچ جنگل سے اُٹھنے والی آندھی کے شور سے مل کر، سمندر کے خروش سے باتیں کر رہی تھی، ہر زندہ شَے، اس فریاد کارِ ظلمت میں، تدارکِ غذا، وگذرانِ زمان کے لئے کبھی شیرانہ جرأت سے کام لیتی تھی، اور کبھی ایک بودی جھجک سے کانپ اُٹھتی تھی۔

ساحل کے قریب جہاں جنگل ختم ہوتا ہے، ایک تنہا موقع

پر، ایک چٹان کے کنارے ایک مرد، غمگین، بیحرکت حالت میں شام کے وقت شام کے ستارہ پر نظر گاڑے ہوئے ہے۔ چہرہ کی سُرخی اس بات کا ثبوت دے رہی ہے کہ رگوں میں پُر صحت خون دَوڑ رہا ہے۔ کندھوں تک لٹکے ہوئے بال گھنے اور چمکدار ہیں اور بتا رہے ہیں کہ جسم کا نشو و نما جوش پر ہے۔

اس مرد نے انگڑائی لی، اور دُور سے ایک شیر کی گرج کو مُسکرا کے سُننا شروع کیا..................

....

....

آریاؤں، اور ہندوستان کے قدیمی باشندوں کے قدیمی باشندوں سے بھی پہلے، ایک قبیلہ ہندوستان سے ہجرت کر کے لنکا کے جزیرے میں جا بسا تھا۔ اس قبیلہ

کی بیتاب طبیعت نے ایک خاندان کو مجبور کیا، کہ جزیرۂ سرندیپ
سے نقل مکان کر کے، اللہ توکل کسی نئے مقام کی تلاش میں
نکل پڑے. کچھ لنکا میں زندگی کی دشواریاں کچھ قدیم انسان
کی سیماب وار طبیعت، غرضیکہ یہ سرندیپ میں بھی نہ ٹھہرے
چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر اپنے تئیں بحرِ ناپیداکنار کے
سپرد کر دیا. سمندر کے طوفانوں نے بہت سی کشتیوں کو
غرق کر ڈالا، صرف ایک کشتی جس میں رئیسِ قافلہ کا بیٹا خارا،
اور سات آدمی اور تھے، جزیرۃ العرب کے جنوب غرب
میں ایک خالی جزیرہ کے کنارے آلگی. عورتیں کچھ تو سمندر
میں ڈوب چکی تھیں، دو ایک جو بچی تھیں وہ مصائبِ سفر
سے جانبر نہ ہوئیں. خارا کی عمر اسوقت چار برس کی تھی.
ان سات آدمیوں نے جو اس جزیرہ تک پہنچے تھے، اُس
قسمت کی ضد پر جس نے اُنہیں اس جزیرے میں لا پھنسایا

تھا، اور گذشتہ پُرلطف زندگی کی یادگار کے طور پر اس بچے کو نہایت چاؤ اور پیار سے پالا، کشتی میں جس قدر آلات و اسلحہ تھے، یہ لوگ انہیں لیکر نکلے تھے، اور سب سے پہلا کام جو اُنہوں نے کیا وُہ یہ تھا کہ خارا کی حفاظت کے لئے زیرِ زمیں غار نما ایک گھر بنایا، اور ایسا انتظام کیا کہ اس میں بھیڑیا، چیتا وغیرہ کوئی درندہ نہ گھُس سکے۔ اِن سات آدمیوں میں سے ایک آدمی ہر وقت خارا کی حفاظت کے لئے رہتا تھا، باقی صید و شکار کو نکل جاتے۔ شکار کا گوشت اور بکریوں کا دُودھ لاکر، اس بچے کو پالتے تھے۔ خارا نے پہلی بات جو سیکھی وُہ اپنے تئیں درندہ حیوانوں سے بچانے کے لئے ان کا مقابلہ کرنا تھا۔ ابھی جزیرہ میں آئے چھ ہی مہینے ہوئے، کہ ایک دِن خارا کے محافظ کو بڑی مسرّت کا دِن نصیب ہوا یعنی غار کے سامنے سے

ایک چڑیا اُڑ کر جا رہی تھی، خارا نے ایک پتھر کھینچ کے
مارا جس سے چڑیا زخمی ہو کر زمین پر آ پڑی۔ اس واقعہ پر
بڑا جنگل میں منگل کیا گیا، اور ان ساتوں آدمیوں نے مل کر
اپنے رئیس زادے کی شان میں گانے گائے۔

اب خارا ہر شے کو جس پر اُس کا بس چلتا، توڑتا،
پھوڑتا، مارتا اُکھاڑتا تھا۔ کسی چڑیا کا گھونسلا ہاتھ لگ جاتا
تو اُسے توڑتا، انڈوں کو پھوڑتا، بچوں کا گلا مروڑتا تھا۔

ایک دن، (کئی سال کے بعد) خارا نے پہلی دفعہ
ایک بارہ سنگھا شکار کیا، ایک بڑا پتھر اس کے سر پر مارا
جس کی ضرب سے بارہ سنگھا گر پڑا خارا اُسے کھینچ کھینچ
کر غار تک لایا، اور اپنے ساتھیوں کو فخر کی ادا سے
دکھایا۔ اُس دن ساتھیوں نے پھر عید منائی اور خوشیاں
کیں۔ اس بارہ سنگھے کے سر کو غار کے مُنہ پر لٹکایا۔

اور چہرے اور ہاتھوں کو روغن ملنے کے لئے، عورت کے ہاتھ کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس ضرورت کو محسوس کرکے ان میں کا ایک بڈھا آدمی، غار کے سامنے کے ایک پتھر پر بیٹھ جاتا اور سفید لٹوں کو ہلا ہلا کے، اور زخمی سینہ کو کھول کے، سمندر کی پُر عناد اور ظالم موجوں کی طرف گھونسا تانتا، اور قسمت پر لعنت بھیجتا۔

خارا اس آفتاب کے تلے، اس کٹیلی پتھریلی زمین پر، ان درندے حیوانوں میں پلا تھا، اس کے ہاتھ سینکڑوں مرتبہ چھل چکے تھے، سینہ پر ہزاروں مرتبہ کھرچیں لگی تھیں، چہرہ تمتما کے تانبا ہو گیا تھا۔

غرضکہ ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے، کبھی اس کے خون کا جوش اسے آدھی رات کو خواب سے بیدار کرکے باہر لیجاتا، اور ایک سائر فی المنام شاعر کی طرح جو فضائے

نامتناہی کی سیر کر رہا ہو، خارا ابھی ایک چٹان پر بیٹھ کر خیالات میں غرق ہو جاتا ؛ یہ ظاہر ہے کہ خیالات اس جزیرے اور خارا کی کل زندگی کی مناسبت سے پُر جدت ہوتے تھے ، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ کبھی کبھی نرم و نازک خیالات ایک سفید چھوٹی چڑیا کی طرح اس کے دماغ کے سامنے اُڑتے نظر آتے تھے ؛ اور کبھی اس کی سیاہ آنکھوں کے سامنے اس طرح مجسّم ہوتے تھے جیسے ہَوا چل رہی ہو اور درختوں کا متحرک سایہ کانپ رہا ہو .

خارا کی عمر اس وقت بیس برس کی تھی ، حسیات کا ہجوم تھا اور اکثر راتیں وُہ کسی پہاڑی پر درختوں میں گذارتا .

ایک شام کو غار میں آیا اور بستر پر جا پڑا ، تین دن تک بُخار میں بیہوش پڑا رہا . اس بُخار کی حالت میں اس کی پیاس بُجھانے کے لئے اور سُوکھے ہونٹوں کو تر کرنے کے

لئے، اُسکے ساتھی اُسے جگا کر پانی دینا چاہتے تھے مگر
وُہ نہیں جاگتا تھا. اس وقت وُہ بڈھا اپنے سوکھے
ہاتھوں کو جس میں رگیں اُبھری ہوئی نظر آتی تھیں اُٹھا اُٹھا
کے کہتا "آہ! ایک عورت! ایک عورت" اور پھر خارا
کی تیمار داری کرتا. آخر خارا نے آنکھیں کھولیں اور اس کی
حالت بہتر ہونی شروع ہوئی، تاہم نقاہت باقی تھی،
ایک شام، یہ ہمراہی خارا کے بستر کے گرد بیٹھے ہوئے
تھے، کہ بڈھے نے ایک پرانا راگ جسے وُہ بھول نہیں گیا
تھا، گنگنانا شروع کیا:-

"جینا تو ایک نیند ہے پیارے، پریم ہے اُس کا سپنا"

خارا نے پوچھا:-

"جینا کیا چیز ہے"؟

بڈھے نے جواب دیا "پریم"

"پریم کیا ہے"؟

"عورت"

اِس طرح خارا سوال اور بڈھا توضیح کرتا تھا۔ غرضکہ نوجوان کو معلوم ہوا کہ زندگی میں کانٹے اور پتھر ہی نہیں ہیں، بلکہ پھول اور خوشبوئیں بھی ہیں، چیرنا، پھاڑنا ہی نہیں بلکہ ملنا اور گلے لگانا بھی ہے۔

اس کے بعد یہ نوجوان اپنے ہمراہیوں سے اکثر علیحدہ رہتا، اور اکثر سوچا کرتا، دن میں اسے اکثر کوئی نہ دیکھ سکتا تھا، کسی تنہا جگہ پر نکل جاتا، اور وہاں ایک مرمر کے ٹکڑے کو لیکر، بڈھے کی بیان کی ہوئی تصویر کے موافق ایک مورت بنانا شروع کرتا، جس کی پوری شکل اس کے خیالخانہ دماغ میں پھرتی ہوتی تھی۔ پہلے سر بنایا، پھر سینہ تراشا، پھر ہاتھ نکالے۔ اس جزیرے کی چٹانوں میں، اور سمندر کے کنارے،

زمرد، الماس، لعل، یاقوت وغیرہ چمکدار اور رنگین پتھروں
کی بہت کثرت تھی۔ خارا نے انہیں جمع کر کے، اس
مورت کی آنکھ سفید اور سیاہ الماس سے، دانت موتی سے
ہونٹ لعل و یاقوت سے بنائے۔ ایک برس کامل اس شغل
میں، بڑی حرص اور بڑے شوق سے مشغول رہا۔ ایک دن
ہمراہیوں نے آکر اسے دیکھا اور بہت تعجّب کیا، لیکن بڈھا
ہنسا اور کہنے لگا: "اچھی ہے مگر حقیقت سے بہت دور
ہے،" تاہم خارا کے لئے یہ مورت ایک بدیعہ خیال تھی۔
اس نوجوان نے اپنے حیات کی تمام قوّت اس مرمر میں
صرف کی تھی۔ صبح سے شام تک نظر اس مورت پر گاڑے
رہتا اور اس درجہ مستغرق ہوتا کہ ہمراہی کھانے کے وقت
آکر اسے جبرًا وہاں سے لیجاتے، اور اسوقت بھی خارا
مورت کی طرف ہاتھ بڑھاتا اور پرشوق نظریں اس پر ڈالتا۔

اِس طرح مہینے گذر گئے۔ خارا، پتھر اور سلیں جمع کرتا تھا
اور اپنے خواب، اور خیالوں کی تصویریں اِن پتھروں سے
بنانا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے خوف تھا تو صرف اس بات کا
کہ بڈھے کے اِعتراض اور اِستہزا سے یہ بچینگی یا نہیں
کبھی ایک مُورت بناتا، وہ ٹھیک نہ ہوتی، اُسے توڑ دیتا،
دُوسری شروع کرتا۔ کبھی دوڑا دوڑا، بڈھے کے پاس آتا
اور اس سے سوال کرتا: "پھر بتانا، عورت کیا ہوتی ہے'
کیسی ہوتی ہے"؟ بڈھا رواں بادلوں پر اپنی نظر گاڑ کر،
اس کے سوال کا جواب دیتا، اور کہتا "عورت! عورت
آدھا میوہ، آدھا پھول ہے" پھر چُپ ہوجاتا اور رونے
لگتا، خارا گھنٹوں اس بڈھے کی آنکھوں پر سوال کی
نظر ڈلے ہوئے، اس کی باتوں کو سُنتا تھا اور سمجھنے کی
کوشش کرتا تھا۔ بڈھا اُٹھ کر، خارا کو لیکے، جنگل میں ایک

طرف جاتا، اور کسی تارے کے نیچے دو جرافے، اپنی گردن ایک دوسرے سے ملائے کھڑے ہوتے انہیں دکھاتا اور کہتا:
دیکھتے ہو، سمجھتے ہو؟ بس!

خارا کچھ نہ سمجھتا، اور پھر سوال آمیز نظروں سے بڈھے کے چہرے کو دیکھتا، خارا نے کئی مورتیں تراشیں، اِس میں وُہ بغیر اُستاد کے، محض اپنی طبیعت کے زور سے ماہر ہوگیا، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اُس نے خود ہی یہ فن ایجاد کیا۔ اس کی حاصل عمر یہ مورتیں تھیں، اور وُہ ان سے بیحد محبّت کرتا تھا، محبّت ہی نہیں پرستش کرتا تھا۔ یہ مقام گویا، اس کا معبد تھا۔ مبارزۂ حیات سے تھک کر، یہاں آتا، اور گھنٹوں مبہوت نظروں سے ان مورتوں کو دیکھا کرتا، اور سوچا کرتا کاش یہ مورتیں سمندر پار کی حقیقت سے خبردار کریں، اور بتائیں کہ اس پرطوفان سمندر کے اُس طرف، ان مورتوں

جیسی زندہ مخلوق ہے کہ نہیں. کبھی اپنے خیالات کے تخیّل کرنے سے عاجز ہو جاتا ، تو غُصّہ میں آکے ، ایک ساعتِ وحشت سے ، کسی مُورت کو توڑ ڈالتا پھر رنج کرتا اور زکل کھڑا ہوتا ، اور جو جانور ملتا ، اُسے بعنوانِ انتقام مار ڈالتا.

رات کا وقت تھا ، گھنے درختوں میں ، خارا چیتے کی کھال بچھائے بیٹھا تھا کہ اتنے میں پاؤں کی خفیف آہٹ سُنائی دی ، تھوڑی دیر میں آہٹ زیادہ واضح ہُوئی . اُس نے سر پھرایا تو دیکھا کہ ایک بارہ سنگھا آرہا ہے ، اِتنے میں ایک لومڑی نکلی . بارہ سنگھے نے اپنے سینگوں پر لومڑی کو اُٹھا کے پھینکدیا . یہ بارہ سنگھے کی شوخی ، وکُلیل تھی . لیکن یہ شوخی وکلیل بہت دیر تک نہ رہی کیونکہ ایک تیندوا بارہ سنگھے پر لپکا ، بارہ سنگھے نے اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنا

شروع کیا۔ خارا، نہایت شوق سے اس گیر و دار اور بھاگ دَوڑ کو دیکھ رہا تھا۔ بارہ سنگھا اپنی تمام قوّت سے دَوڑ رہا تھا یہانتک کہ تھک کر اس کی رفتار میں سُستی معلوم ہُوئی؛ پسینہ میں شرابور ہوگیا اور ہانپنے لگا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود اُسے اپنی جان کی سلامتی کی اُمّید نہ رہی تھی۔ پندرہ منٹ کے اندر، تیندوا بارہ سنگھے تک پہنچ گیا اور اُسے دبوچ لیا۔ خارا، تعجّب کر رہا تھا کہ بارہ سنگھا بہت جلد مغلوب ہوگیا؛ اور اس کا دل چاہتا تھا کہ بارہ سنگھے کو کسی طرح مدد پہنچائے کہ اِتنے میں ایک گرج سُنائی دی اور ایک بڑا سایہ جھپٹتا نظر آیا؛ سر پھرایا تو کیا دیکھتا ہے کہ یکّہ تازِ میدانِ شجاعت، بادشاہِ بیابانِ وحشت یعنی شیر چلا آرہا ہے۔ شیر نے تیندوے، اور بارہ سنگھے پر، ایک پُرغیض و غضب نظر ڈالی، اور پھر ایک پُرہول ڈکار کے ساتھ پھلانگ

مارتا نظر آیا، تیندوا، پہلے تو باوجود اپنی تھکن اور ضعف کے
ہر حیہ باداباد آمادہ مقاومت معلوم ہوتا تھا لیکن شیر کی
زہرہ ریز گرج نے جو اُس نے اپنی تمام قوت سے کی تھی،
تیندوے کے حواس باختہ کر دیئے، اور وہ مجبوب اور منفعل
کانپتا ہوا، اپنا شکار اور اپنی نخوت شیر کے لئے چھوڑ گیا۔
تھوڑی دیر تو تیندوے نے آثارِ غصّہ ظاہر کئے تھے اور
اُس کی طرف گھُور کے دیکھا تھا، لیکن شیر کی آتش ریز آنکھوں
سے کون آنکھیں ملا سکتا تھا۔ اِن آنکھوں کا دوچار ہونا
تھا، اور گرج کا نکلنا تھا کہ تیندوے نے ہار مان لی۔ شیر
نے، بارہ سنگھے کے جسم پر اپنے پنجے گاڑ کر، اُسے ٹکڑے
کرنا شروع کئے۔ خارا جو اس سے پہلے بارہ سنگھے اور
تیندوے کی کشمکش بے پروائی اور بغیر خوف کے دیکھ رہا
تھا، اب ذرا سنبھل بیٹھا۔ اُس کے دل میں خوف اب بھی

نہ تھا، لیکن ذرا احتیاط سے بیٹھا ہوا تھا۔

اب شیر لپ لپ کر کے خون پی رہا ہے، ہڈیوں کو چبا رہا ہے۔ اور جھوم رہا ہے۔ غلبہ اور کامیابی کے نشہ میں، اپنی دُم دائیں اور بائیں مار رہا ہے۔ اور اس پُرلطف ضیافت کو کھاتے وقت، مزے میں آ آ کر کبھی اپنا سر اُٹھا کے اوپر کو دیکھتا ہے۔ ایک دفعہ اُس نے اپنی دُم اُٹھا کے، اور اپنے اگلے پاؤں، بارہ سنگھے کے مُردہ جسم سے ہٹا کے نظرِ تفتیش سے اِدھر اُدھر دیکھا، اور پھر اُس کے سر اور اُن ہڈیوں کو جن پر ابھی گوشت باقی تھا، چبانے کے لئے وہاں سے گھسیٹ کر لیجانا شروع کیا، اتنے میں شیر کی نظر خارا پر پڑی، اور اس زرد خونخوار، طاقتور مخلوق کی آنکھیں، اس جزیرے کے جوان انسان سے دوچار ہوئیں۔ آدھ گھنٹہ پہلے، خارا اس احتشام مجسّم یعنی شیر کو، اس کی ہیبت اور طاقت سے متاثر ہو کر دیکھ رہا تھا، اور اس غالب مغرور

کی دل میں عزت کر رہا تھا لیکن اسوقت جبکہ شیر اس کے سامنے تھا، اس وقت ایک قدرتی جوش مقابلہ سے وُہ اسکی طرف بڑھا۔ شیر بھی جاتے جاتے رُک گیا، اور شاخوں اور پتّوں کو اپنے پاؤں کے نیچے دباتا، توڑتا، اور کھڑبڑ کرتا ہوا خارا کی طرف چلا۔ غرضکہ لڑائی کی ٹھن گئی، اور خارا نے شیر کے بائیں طرف سے اُس پر حملہ کرنے کی ٹھہرالی۔

شیر نے سر اُٹھا کر پھر اُسے دیکھا، اور اس پر کُودنے والا ہی تھا کہ خارا نے ایک سیکنڈ رائگاں نہ کر کے، کمان کو پُوری طاقت سے کھینچ تیر چھوڑا۔ تیر ایک ہُوا چاک سرسراہٹ سے اُس کی طرف گیا اور گردن میں گُھس گیا۔ اس کے ساتھ ہی خارا نے اپنی ڈھال سنبھال کے، اور ایک ہولناک "ہاؤ" کا نعرہ مار کے بائیں طرف پُھرتی سے پھر کر، اپنا گرز شیر کی گدّی میں (جو چھلانگ مار کر اس پر چھا گیا تھا) مارا۔ پُھرتی اور طاقت خارا کے جسم میں

بچپن سے ایسے مشاغل میں رہنے کی وجہ سے ہم جیسے آدمیوں کی نہ تھی۔ پس اُس نے اِدھر اپنی تمام قوتِ بازو سے گرز مارا اور اُدھر اپنی کمر سے برچھی نکال کے، اب مارے غصّہ کے دیوانہ شیر کے پیٹ میں پوری گھسیڑ دی، اس دفعہ اس درندہ جانور نے، پیچ کھا کے، خارا کے بائیں بازو کو پکڑنا چاہا، لیکن اُس کے مُنہ میں خارا کی ڈھال جو وہ بائیں ہاتھ میں لئے ہوئے تھا آگئی، اور شیر نے شدّتِ غضب اور درد میں اُسی کو چبانا شروع کیا، لیکن اس عرصہ میں بیحد خون شیر کے جسم سے نکل چکا تھا، اور اُس پر ضُعف طاری ہونا شروع ہو گیا تھا۔ خارا نے ایک دفعہ پھر پہلے کی طرح نعرہ مار کے، اور پہلی جیسی قوت سے برچھی کو گھسا دیا، آخرکار، شیر اپنی غرور جنسی کے باوجود، زمین پر آرہا۔ لیکن نوجوان نے اس گرنے کو اور اس مغلوبیت کو حیلہ تصوّر کیا، اور برچھیوں پر برچھیوں کے

وار کرتا رہا۔

مگر اب شیر کی زرد، بے نور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، پنجے پھیلے تھے، مُنہ بغیر نفس کے کشادہ تھا، جس میں سے اُسکے بڑے دانت باہر نکلے ہوئے تھے؛ جو خون سے سُرخ ہو رہے تھے۔ یہ وُہی شیر تھا، جس کی مہیب آواز اندھیری راتوں میں ہر جاندار کو کنپا رہی تھی، وُہی شیر اب اُس کے پاؤں کے تلے مسکین حالت میں پڑا ہوا تھا۔ یہ خیال آخارا کے دل میں گذرا، تو اس کا سینہ ایک شیریں غرورِ جلاوت سے اُبھرا، اور وُہ ایک خود کام نمائش کے ساتھ، اپنی تیر و کمان، ڈھال، برچھی اور گرز کو ایک جگہ رکھ کے نہایت فخر کی ادا سے شیر پر بیٹھ گیا، اور متخیل اور متفکر نظروں سے مشرق میں آہستہ آہستہ اُبھرتے ہوئے نور پاش ماہتاب کو دیکھنے لگا۔

رات کی سیاہ پلکیں کھلنے کے بعد، صبح کا رنگین نور، آسمان
میں اِدھر اُدھر سنہری تیر پھینک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تیر، تیز
اور پُر جدّت ہونے شروع ہوئے۔ اور نوجوان کی آنکھیں صبح
کے وقت، اور موقع اور گذشتہ واقعہ کی یاد سے پُر نور، اور
اس کا دل، دُور سے دکھائی دینے والے سمندر کے شور
کو سُن سُن کر، ذوقِ حیات سے متلذّذ ہو رہا تھا۔ اِتنے
میں کیا دیکھتا ہے کہ نہایت پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ، رنگوں
میں لپٹی ہوئی ایک شئے صبح کے ایک مجسم ٹکڑے کی طرح، ہوا
میں تیرتی ہوئی، خارا سے کچھ دُور زمین پر آ رہی۔ تھوڑی
دیر میں، وہاں پہلے تو مشکوک اور مبہم اور پھر عیاں اور واضح
ایک شکل لطیف پیدا ہوئی۔

خارا کا رفیق بڈّھا، جب کبھی نہایت تھک جاتا، یا کسی
اضطراب میں ہوتا، یا اَور کسی تکلیف سے بیتاب ہو کر، "عورت..."

عورت ، عورت" کہ کہ کے آہیں بھرا کرتا تھا اور
خارا پوچھتا تو بیان کرتا کہ وُہ کیا شئے ہے ۔ غرضکہ
یہ نازک شئے ، اُس بُڈھے کی بیان کی ہُوئی چیز سے
بہت ملتی تھی ۔ اور اُس مُورت سے ، (جسے اُس
نے بُڈھے کی تعریف کے مطابق ، پتّھر سے
تراش کے بنائی تھی) بہت مُشابہ تھی ۔ اُس کو
دیکھکر نوجوان کا دِل ایک عجیب پُرشوق رِقّت سے
کانپنے لگا ۔ اور اُس نے اُس کی طرف اپنے ہاتھ
بڑہا دیئے ۔ اور سوچنے لگا کیا مَیں خواب دیکھ رہا
ہوں ؟ اُس کا دِل چاہتا تھا کہ دَوڑ کے اُس سے جا
ملے ، اُسے پکڑلے ۔ لیکن اُس سے شیر کی طرح
لڑائی نہیں لڑنا چاہتا تھا ؛ بلکہ یہ چاہتا تھا کہ یہ شکار
جو اس قدر رنگوں میں ، اس قدر محبّت آمیز اِحتشام'

اور ایسی نرماہٹ سے کے ساتھ زمین پر آیا ہے، اس شکار کو آہستہ آہستہ جا کے نہایت ہلکے سے چھوئے اور اُسے خوف نہ دلائے، بلکہ پھسلا پھسلا کے چمکا چمکار کے پکڑ لے۔ سوچا کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ اور یہ سوچ کے، سب آلاتِ حرب ایک طرف رکھ دیئے، اور دبے پاؤں اُس کی طرف چلنا شروع کیا۔ دو قدم نہ رکھے ہونگے، کہ جیسے نسیم کسی چھوٹے پودے کو ہلاتی ہے، یہ خیال دلفریب بھی جُنبش کھا کے بادلوں کی طرف ہٹنا اور خارا سے دُور ہونے لگا۔ اور ایک منٹ کے بعد، زمین پر چٹان کے ٹکڑوں اور پتھر کے روڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

عُمر میں یہ پہلی دفعہ تھی کہ خارا رویا۔ غار کو نہایت

رنجیدہ حالت میں واپس آیا اور اپنے ساتھیوں کو ساری سرگذشت سُنائی ۔ ساتھیوں میں سے بعضے کہنے لگے "یہ خیال تھا"، اور بعضوں نے کہا : نہیں، تم نے خواب دیکھا ہے" ۔

---

(۳)

شیرازہ

ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے ۔ اب خارا سوچا کرتا تھا کہ کیا اِن پتھروں اور کانٹوں سے رہائی ممکن ہے کہ نہیں ؛ کیا اُس زخم کا جو اُس کے دِل میں ہے کوئی علاج ہے کہ نہیں ۔ دُوسرے اُفقوں کو کشف کرنے ، نئے شکار، شکار کرنے ، اس کے قعرِ جان میں جو خالی خالی ایک کونا محسوس ہوتا تھا ، اسے بھرنے اُس کے دِل میں جو ایک نامعلوم کمی تھی اُسے پُورا کرنے کی آرزو ، اُسے پاگل کئے دیتی ہے ۔

وُہ بیمار نہ تھا ۔ کھانا پہلے کی طرح کھاتا ہے ؛ بھوک
کھُل کے لگتی ہے ، درندوں کا شکار پہلی طاقت و قوت
سے کرتا ہے ۔ زندہ رہنے کی خواہش قائم ہے ، ہر لڑائی
اور مقابلہ میں جیتنے کی خواہش باقی ہے ۔ پھر یہ ہر جگہ اور
ہر وقت جو کمی اُسے محسوس ہوتی ہے ، یہ کیوں ؟ یہ کس لئے ؟
یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا ، اُسے سمجھنا چاہتا ہے ؛ لیکن
اپنے ساتھیوں سے اس کا ذکر نہیں کرتا ۔

جب یہ لوگ جزیرہ میں آئے تھے ، اُسوقت سے
اُسوقت تک یہاں سے چھٹکارا پانے کے خواب تو بہت
دیکھے ، لیکن سمندر میں پہلی دفعہ مصیبت اُٹھانے کے بعد
کسی کی ہمّت نہ پڑتی تھی کہ پھر اُس طوفان خیز ، بے رحم ،
کس ناشناس موجوں کو اپنی جان سپرُد کر دے ، پس سوائے
اس کے کہ اس شکستہ کشتی کی تقلید میں جو انہیں اس جزیرے

اور خوشی پھیلا رہی تھی ۔

اگرچہ چاندنی رات تھی، لیکن آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے، چاروں طرف کی چیزیں صاف نظر نہ آتی تھیں ۔ خارا اس خفیف تاریکی میں اس غیر معمولی حالت ؛ اس راحت، نغمہ و خوشبو کو بچوں کی طرح ہمک کے لینا چاہتا تھا لیکن ان سب سے مست ہو کر ۔ آنکھیں اور ہونٹ کھولے، سر پیچھے کو ڈالے کشتی میں پڑا تھا ۔ اس کے کان جو درندے حیوان کی پر ہول آوازوں سے آشنا تھے ، اب بُلبل کا ترانہ سُن رہے تھے ، اس کا جسم جو کانٹوں اور پتھروں سے چھدا اور چھلا کرتا تھا ، پھولوں کی خوشبوئیں اس جسم کو آ آ کر لپٹ رہی تھیں ۔ اور اس پر ایک پُر لطف اور اشتیاق انگیز سُستی طاری ہو رہی تھی ۔ خارا اس قدر دلشاد تھا اور ایسا لُطف اُٹھا رہا تھا کہ اس خوف سے کہ اس میں خلل نہ پڑ جائے،

کشتی میں ذرا نہ ہلتا تھا ۔

جس وقت صبح ہوئی، اور گردونہ گلگونہ آفتاب اپنے مطلع احتشام سے نکل کر آہستہ آہستہ اُوپر کو بڑھا، اس وقت درختوں کے سبز پتّے اور رنگ برنگ کے پھول چمک اُٹھے، اور پتّوں پر قطراتِ شبنم موتی بن گئے ۔ خارا اس سے بیخبر کہ کہاں آیا ہوں، اور اِس سے غافل کہ کیا دیکھ رہا ہوں، متحیّر نظریں چاروں طرف ڈال رہا تھا ۔ اِتنے میں درختوں کے پیچھے سے ایک گردباد اُٹھتی، اور قہقہہ اور زمزمہ کے ساتھ خارا کی طرف بڑھتی نظر آئی ۔

نوجوان خارا، جو اب تک نہیں جانتا تھا کہ ڈر کیا چیز ہے، اس وقت ایک خلجان اور گھبراہٹ سے کانپنے لگا، اور ہر احتمال کے مقابلہ کے لئے تیاری کرنے لگا ۔ یہ صرصر رنگ و سحاب آہستہ آہستہ خارا جہاں کھڑا تھا،

اُس سے کچھ فاصلہ پر سمندر کے کنارے آکر رُک گئی ؛ اور جب خاک چھٹی، تو اُس میں سے ایک جسم منوّر ظاہر ہوا۔ خارا پہلی نظر میں نہ سمجھ سکا کہ آیا آفتاب زمین پر اُتر آیا ہے، یا میں آسمان پر ہوں۔ یہ سوچے بغیر کہ کیا کرنا چاہیئے، وہ اپنی کشتی سے نکلا، اور حسبِ معمول اُسی "ہاؤ" کے ساتھ اُس نے اُس پر حملہ کیا، کہ یکایک ایک تیر نے سامنے سے آکر خارا کو زخمی کردیا۔

نسرین نوش اپنا دل بہلانے کے لئے، اکثر اپنی ماں سے اجازت لیکر شکار کو نکلا کرتی تھی، اِس صبح کو، اپنی سہیلیاں پیچھے چھوڑکر، وہ بہت آگے نکل گئی تھی، اور آخر کار تھک کر ساحل تک شکار، اور غُسل کے لیئے آئی تھی۔

خارا جیسی مجہول اور غیر معلوم شکار کو دیکھکر، اُس نے فوراً اس پر تیر چھوڑا تھا جس سے یہ شکار زخمی تو ہوا، لیکن نسرین نوش نے دیکھا کہ زخم کھاکے وہ اس کی طرف جھپٹا، اور قبل اس کے

کہ دُوسرا تیر چھوڑے، اُس نے اپنے تئیں شکار کی آغوش میں پایا۔ اور شکار، اور شکار کرنے والی کی نظریں ایک آتش ریز حرارت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملیں۔
نسرین نوش سمجھتی تھی خارا کوئی نیا شکار ہے، خارا سمجھتا تھا نسرین نوش کوئی شکار کرنے والی چڑیا ہے۔ مگر نہ معلوم کیا بات تھی، اور کیا سبب تھا، ان کے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیوں اُنکی نظروں میں ایک دُوسرے کے لئے کشش تھی۔ دونوں کے دِلوں میں گھبراہٹ تھی، جانے کیسے، خارا کی فریاد سے نسرین نوش، اور نسرین نوش کی پُر خلجان مُسکراہٹ سے خارا نے سمجھ لیا کہ ہم ہمجنس ہیں۔ نسرین نوش کا نرم ریشمیں لباس بارہ سنگھے کی کھال کے کپڑوں میں جسے خارا پہنے ہُوئے تھا پھنس گیا؛ دونوں نے اُسے چھُڑانا چاہا، مگر دیکھتے کیا ہیں، کہ ایک کا ہاتھ، دُوسرے کے

ہاتھ میں ہے؛ اور ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو محبّت سے
دبا رہا ہے۔
خآرا نے اپنے اوپر جو نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ تیر کے زخم
سے خون نکل رہا ہے، کچھ اس تردّد سے کچھ نہ معلوم کیوں
خآرا نے اپنے کل ہتھیار زمین پر ڈال دیئے۔ نسرین نوش
کے ہاتھ سے بھی حیرت کی وجہ سے تیر گر پڑے تھے۔
اب اِن دونوں میں اپنے آپ، ایک بے تکلّف،
بے مراسم، مگر اسرار انگیز آمیزش نہانی پیدا ہو گئی۔ نسرین نوش
اس سے پُوچھ رہی تھی: "تو کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے"
اور خآرا اشاروں سے سمجھا رہا تھا: "دُور سے آیا ہوں؛
کانٹوں سے، پتھروں سے آ رہا ہُوں"۔ ہاتھوں کے
ملنے سے، نوجوان خآرا کے جسم میں ایک عجیب برقی
حرارت سرایت کر گئی تھی، جس کی وجہ سے وُہ کانپ رہا

تھا۔ ادھر خون نکلنے کی وجہ سے، اس کے چہرہ کا رنگ اُڑا
جا رہا تھا۔

نسرین نوش نے آہستہ آہستہ تیر، خارا کے پہلو سے نکالا۔
خون کو اپنے کپڑے سے پونچھا، اور زخم دھویا، پھر جا کے
قریب سے چند پتّے لا کے زخم پر باندھے۔ انہیں باندھتے
وقت، نسرین نوش جو خارا پر جھکی تو ایک مرتبہ پھر اُن دونوں
کی نظریں، نظریں کیا، ان دونوں کی رُوحیں، ایک مبہم شوق
کے ساتھ، ایک دوسرے سے ملیں، اور اس دفعہ دونوں
کی آنکھوں میں سے ایک جانفروز چمک، ایک دلسوز چنگاری نکلی
موجیں ساحل کی طرف کیسے آتی ہیں؟ آفتاب کائنات پر
کس طرح روشنی ڈالتا ہے؟ شہد کی مکھی کس طرح پھولوں کی
طرف جاتی ہے؟ بس بالکل اسی طرح، ان دو بیگانۂ روح آشنا
کے ہونٹ، ایک قدرتی کشش، ایک قدرتی شوق

کے ساتھ، ایک دوسرے سے ملے۔

یہ جزیرہ گو، بے انتہا خوبصورت تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ ایک گراں خواب میں سو رہا ہے، اور ہمیشہ سے کسی چیز کا انتظار کر رہا ہے۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کا بوسہ لینا تھا، کہ جزیرے کے پرند، چہچہا کر اُڑنے لگے، تمام کلیاں، ایک دم کھل گئیں۔ ایک گرد آہنگ و رنگ ایک زمزمۂ جوش و خروش نے کُل جزیرے کو گھیر لیا۔ اسوقت دونوں، (خارا و نسرین نوش) مدہوش اور بیخبر پڑے ہوئے تھے۔ خارا کو ایک ایسی خوشی حاصل ہو رہی تھی، جو اُس نے تمام عمر میں اب تک محسوس نہیں کی تھی۔ اور اس نشہ کی لذت سے، اُس کی آنکھوں کی پُتلیاں کھیل رہی تھیں، آغوش کھُلی ہوئی تھی، سینہ سانس کی وجہ سے اُبھر رہا تھا اور دِل ایک ننھّی چڑیا کی اُڑان کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔

پہلے نسرین نوش ہوش میں آئی تو دیکھا کہ اس کے ہونٹوں
پر، جہاں خارا نے بوسہ لیا تھا ایک پھول کھلا ہوا تھا، یہ کیا؟
اُس نے سوچا تو یاد آیا کہ ایک مرتبہ، جب وُہ سو نہیں رہی تھی
بلکہ آنکھیں بند کئے تھی، اور اس کی ماں حسبِ معمول اُسے دیکھنے
آئی تھی، تو اُس نے کہا تھا: "خُدا نہ کرے، مجھے خبر ہُوئے
بغیر، یہاں کوئی مرد آئے، لیکن اگر آیا تو مجھے معلوم ہو جائیگا
کیونکہ اگر اُس نے میری بیٹی کا بوسہ لیا، تو بوسہ کی جگہ پھول کھلینگے
اور اس سے مجھے پتہ لگ جائیگا"۔ ماں کی یہ تقریر جب نسرین نوش
کو یاد آئی، تو وُہ گھبرائی، ایں تو یہ مرد ہے! یہ وُہ چیز ہے،
جس سے میری ماں مجھے بچانا چاہتی تھی! اب کیا کروں؟
یہ تو بڑا غضب ہو گیا۔ بڑی بُرائی ہُوئی، گر بُرائی کہتے وقت
دِل کہتا تھا: "اگر بُرائی ہے، تو شیریں اور پُر لُطف بُرائی ہے"۔
اب نسرین نوش ہزار طرح سے خارا کو سمجھانا چاہتی ہے، کہ

میری ماں آئیگی تو تجھ پر بہت خفا ہوگی، جا، جہاں سے آیا ہے، وہاں بھاگ جا" لیکن خارا، نہ سمجھتا تھا، نہ سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ آخر عاجز ہوکر نسرین نوش رونے لگی، اور آنسو اُس کے سُرخ رُخساروں سے ڈھلک کے، زمین پر گرنے لگے۔ یہ آنسو گرتے ہی، موتی بن جاتے تھے۔

خارا، اس رونے سے بھی کچھ نہ سمجھا، بلکہ پہلی لذت کا جو اثر دماغ میں بسا ہوا تھا، اس سے متاثر ہوکر، پہلے جوش و اشتیاق کے ساتھ نسرین نوش کو آغوش میں لے کر اُن رونے والی، آنسوؤں سے تر آنکھوں کو چومنے لگا۔ اور جب نسرین نوش نے اپنے ہاتھوں سے، اُسے اپنے پاس سے ہٹانا چاہا، تو خارا نے، ہاتھوں ہی کو پکڑ کے چومنا شروع کر دیا۔

نسرین نوش، اس وحشی گر فسوں کار، سودا زدہ مرد

کی آغوش سے چھٹکارا ، پانے کی کوشش کر رہی تھی ، کہ دُور سے ،
اُس کی ماں آتی ہوئی دکھائی دی . وُہ ماں ، جو مرد کو سب سے
بڑی مُصیبت خیال کرتی تھی ، وُہ ماں ، جو رات دِن اُسی دُھن
میں رہتی تھی کہ مرد کا گذر اس جزیرے میں نہ ہو ، اب مرد کے
روبرو تھی . اس کشمکش میں ، اور نیز اپنی ماں کو آتا دیکھ کر ، نسرین نوش
گھبراہٹ اور خوف کی وجہ سے بیہوش ہو گئی . خارا نہیں
جانتا تھا کہ بیہوش ہونا کیا چیز ہے ، اس لئے اُس نے اس
بیہوشی کو ایک ادائے تسلیمیت خیال کیا ، اور نسرین نوش کے
پریشان اور بکھرے ہُوئے بالوں سے لیکر ، پاؤں تک لگاتار
بوسے لینے شروع کر دیئے اور سر سے پاؤں تک جہاں جہاں
بوسے لئے تھے ، وہاں پھول کھل گئے ، یہاں تک کہ
نسرین نوش کے جسم پر کوئی جگہ خالی باقی نہ تھی جہاں پھول نہ کھلے
ہوں . (نسرین نوش کی ماں کے خارا تک پہنچتے پہنچتے نسرین نوش

ایک گلدستۂ لطیف بنگئی تھی۔

بڑھیا، اپنی بھویں اٹھا اٹھا کے، خارا سے، اس جزیرے میں آنے کا سبب پوچھتی تھی، مگر خارا، نہ سمجھتا تھا، نہ سمجھنا چاہتا تھا، بس اپنے ہاتھوں میں کے گلدستے کو دکھاتا تھا، اور اپنی آغوش میں لیکر بھینچتا تھا، بڑھیا نے خیال کیا کہ بہتر یہی ہے کہ اسے جزیرے سے نکال دوں، کیونکہ میں اس کا مقابلہ تو کر نہیں سکتی"، یہ سوچ کے اس نے اپنی جریب سے اشارہ کیا جا" اس جزیرے سے نکل جا"

خارا فوراً گلدستے کو اپنی گود میں اٹھا کر، کشتی میں جا بیٹھا۔

نسرین نوش اب تک بیہوش تھی۔ اس دفعہ ہوا اور موجوں نے خارا کی کشتی کی مدد کی، اور وہ بہت جلد جزیرۂ خارستان کو پہنچ گیا، جزیرے کے کنارے، اس کے تمام ساتھی، پریشان، مضطرب، منتظر بیٹھے تھے۔ خارا، اپنے مال

غنیمت، یعنی اس گلدستۂ رُوح و راحت کو لیکر کنارہ پر آیا، تو اسکے تمام ساتھیوں نے جو مدت سے ان پھُولوں کی خوشبو سے محروم تھے بکمالِ احترام، اس گلدستہ کی خوشبو سے اپنی مشامِ جان کو معطر کرنا شروع کیا۔ جب خارا نے اپنی سرگذشت سُنائی، تو ساتھیوں نے تحسین اور حیرت بھری نگاہیں اس پر ڈالیں اور سب سوچنے لگے کہ زندگی کی بڑی کمی کو پُوری کرنے والی یہ چیز، یہ لازمۂ عمر یعنی یہ عورت کس طرح ہوش میں لائی جائے۔ آخر سب نے کہا کہ بڈھے کے پاس (جو غار میں تھا، ساحل تک نہیں آیا تھا) لے چلنا چاہئیے، وہ کوئی ترکیب بتائیگا۔ بڈھے نے تمام حال کو سُنا، اور خوشی خوشی اپنے تمام تجربوں سے جو ہندوستان و سرندیپ میں اُسے حاصل ہوئے تھے، نسرین نوش کو ہوش میں لانیکی کوشش کی۔ دوائیں دیں، منتر پڑھے، پانی چھڑکا، یہانتک کہ صبح ہوئی اور آفتابِ عالمتاب،

دنیا کو حرارت اور زندگی دیتا ہوا نمودار ہوا، اور اُس وقت نسرینِ نوش کے جسم کے پھول، ایک ایک کر کے، زمین پر گر پڑے، اور یہ عورت اپنے تمام عورت پن اپنی تمام نسوانیت، اپنی تمام شفقت، اپنی تمام شعریت کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اب نسرینِ نوش، اپنے تئیں خارا کے قوی بازوں پُرجوش سینے میں پانے سے خوش تھی؛ اور ایک نسوانی غرور کی ادا سے، چاروں طرف دیکھتی تھی، اور ہنستی تھی۔ اس کے ہنستے ہی، اس خشک جزیرے کے پہاڑ اور گھاٹیاں سبز ہوگئیں سیاہ و غمناک کانٹے، پھول اور سُنبل بن گئے۔ اور عورت کی جادو بھری نظر، اور نیم خندۂ سحر نے، اس مُصیبت زدہ طائفہ کو جو مدّت سے شفقت کے لئے ترس رہا تھا، جانِ تازہ بخشدی، اور یہ لوگ اُن عذابوں کو جو انہوں نے اُٹھائے تھے

آن کی آن میں بھول گئے ۔

ہیرے، موتی، زمرد، لعل، یاقوت، فیروزے وغیرہ جو اس جزیرے میں پڑے ہوئے تھے، اور کوئی اُن کی بات نہ پوچھتا تھا، اب جمع کر کے لائے گئے، اور نسرین نوش کے قدموں پر ڈال دیئے گئے ۔ اس حُسن و آن کو دیکھ کے بڈھا مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا، اور سر ہلا ہلا کے کہتا تھا:

"ہاں! محبت پاش، سودا ریز بال نہ ہوں، جن میں ہیرے لگائے جائیں تو ہیروں کی کیا قدر ہو سکتی ہے اور اگر نازک انگلیاں نہ ہوں، تو یاقوتوں سے، زمردوں سے، اور پیاری گوری گردنیں نہ ہوں، تو موتیوں کے وجود سے کیا فائدہ"۔

بڈھا مارے خوشی کے متوالا سا ہو گیا تھا، کچھ چپ ہو جاتا، لیکن ترنگ میں آ کر پھر کہنا شروع کرتا:

"عورت! عورت! عورت ایک بیل ہے جو خشک درخت کے

گرد لپٹ کے، اُسے تازگی، اُسے زینت بخش دیتی ہے:
وُہ ایک دُھونی ہے کہ محبّت کی لپٹ سے مرد کو گھیر
لیتی ہے . بغیر عورت کے مرد، سخت دِل ہو جاتا ہے،
اَکھڑ کھرا بن جاتا ہے، یہ عورت کی شفقت و نوازش
یہ اُس کے مُسکراہٹ کا ہی اثر ہے کہ مردوں کا سینہ عالی
اور رقیق حسّیات سے منوّر ہو جاتا ہے"۔

اب نسرین نوش کو ایک دستِ قوّت مِل گیا تھا، جو اُسے
آغوش میں لے، اور خارا کو ایک دستِ شفقت ہاتھ لگ گیا
تھا، جو مبارزۂ حیات کی اذیّتوں کو بھلا دے .

بُڈّھا اس جوڑے کو دیکھ کر، وفورِ مسرّت سے چپ نہ رہ سکتا،
ناچنے لگتا، پھر کہتا:

"عورت میں حُسن نہ ہوتا، تو مرد میں جراُت اور عالی
حوصلگی نہ ہوتی؛ مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی، تو عورت کی

خوبصورتی و دلبری رائگاں جاتی"۔ سے

الحمد لمن قدر خیراً و حالاً والشکر لمن صور حسناً و جمالاً



اِزدواجِ محبّت

بچھڑے دوستوں سے بھی مل کے کیسی خوشی ہوتی ہے!
بس خود آپ ہی اندازہ کر لیجئے۔ آخر کار آپ کا بھی تو کوئی
دوست بچھڑ گیا ہوگا اور پھر آپ سے اچانک آ ملا ہوگا۔
آپ ہی فرمایئے کیا شادی مرگ کا خوف نہیں ہو جاتا۔
میری بھی واللہ، ایک ہفتہ ہوا یہی کیفیت ہوئی۔ اتفاق
سے ایک کام کے باعث میرا جانا علی گڑھ ہو گیا۔ میں
کالج کے دیکھنے کا عرصہ سے مشتاق تو تھا ہی، اس موقعہ
کو غنیمت جانا، اور ایک زائر کی حیثیت سے کالج کے
احاطہ میں قدم رکھا۔ پہلے سر سیّد مرحوم کی قبر پر فاتحہ

پڑھا، پھر کالج کی سیر میں مصروف ہوا۔ ہر چیز کو عظمت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور جس عمارت پر نظر پڑجاتی اُس میں محو ہوجاتا تھا۔ اس اِستغراق کی حالت میں اِک نظر اِک صاحب پر بھی جا پڑی جو میری طرح محوِ نظارہ تھے۔ مَیں آپ سے سچ کہتا ہُوں کہ جب تک کوئی ایسی ہی خاص کشش نہ ہوتی میں کالج سے آنکھ تھوڑا ہی اُٹھانیوالا تھا۔ لیکن ان پر نظر پڑنی تھی کہ میں اپنے گِرد وپیش کی کل چیزوں کو بھول گیا اور بے تابانہ ان سے جا کر لپٹ گیا۔ اوّل تو وُہ جھجکے، لیکن پھر ایک استعجاب آمیز "تم کہاں"؟ کہہ کے مجھ سے لپٹ گئے۔ اصلیت یہ تھی کہ ہم دونوں بچھڑے ہُوئے کم وبیش تیرہ چودہ برس کے بعد ملے تھے۔ مَیں اِس بات کو طُول نہ دُونگا، کہ ہم دونوں کیسے جُدا ہُوئے تھے اور مَیں ان تیرہ چودہ برس میں کہاں کہاں رہا۔ مختصر یہ ہے کہ مجھ میں اور میرے دوست محمد نعیم میں بُعدالمشرقین

رہا، اور ہم اس زمانہ میں ایک دوسرے کے حالات سے بالکل بے خبر رہے. میں برہما میں تھا، تو وہ انگلستان میں؛ اور وہ بھی ایک زائر بنکر علی گڈھ آئے تھے. محمد نعیم کو دیکھتے ہی کالج کی سیر کچھ وقت کے لئے موقوف ہوئی اور ایک دوسرے کے حالات دریافت ہونے لگے. آخرکار ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن بعد ہمیں ایسٹ انڈین ریلوے کی ڈاک گاڑی عظیم آباد کی طرف لیجارہی تھی، جہاں میرے دوست ڈاکٹر نعیم ایم. ڈی. ایل. آر. سی. پی (کیونکہ اب مجھے معلوم ہوا کہ اس عرصہ میں محمد نعیم انگلستان جاکر ایم. ڈی ہو آئے تھے) کا مکان ہے.

عظیم آباد پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنی عالیشان اور بے نظیر کوٹھی میں اُتارا. اور اُسی روز اپنے کل احباب کی دعوت کی تاکہ مجھ سے ملائیں. دعوت کے بعد سب لوگ

باہر چمن میں آ بیٹھے، اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر یکے بعد دیگرے سب رخصت ہو گئے اور ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔

چونکہ گرمی کا موسم تھا، اِس لئے رات کا وقت، چاندنی رات، صحنِ چمن اور ٹھنڈی ہَوا ایسی چیزیں نہ تھیں کہ ہم میں سے کسی کا دِل اُٹھنے کو چاہتا۔ باہر ہی کُرسیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ باتوں باتوں میں یہ ذکر آ گیا کہ انسان کی زندگی میں ایسے دلچسپ واقعات نہیں ہوتے جن میں ناول کا مزہ آئے۔ مَیں اس بارے میں بہت بھرا بیٹھا تھا۔ مَیں نے ناول نویسوں پر نہایت لے دے شروع کی کہ "کمبخت ایسی ایسی باتیں لکھتے ہیں کہ ہمیں رشک ہوتا ہے کہ ہماری زندگی میں کیوں ایسے واقعات پیش نہیں آتے" اور کیا اور کیا' بہت ہی کچھ کہہ ڈالا۔ نعیم چپکا سُنا کیا، صرف ایک آدھ جگہ مُسکرایا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ کیوں اپنی رائے ظاہر نہیں کرتے۔ خیر، جب مَیں سب کچھ کہہ چکا

تو نعیم نے ایک اور مضمون پیش کیا۔ کہنے لگے: "آج کل پردہ کی بحث چھڑی ہوئی ہے، تمہاری اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ جدید خیال ہو یا کہنہ خیال ہو۔ کہنہ خیال ہو گئے کیونکہ پردہ کی مخالفت تو تم سے قیامت تک بھی نہیں ہو سکی"۔

میں نے کہا: "بیشک پردہ کی مخالفت کون صاحب عقل کر سکتا ہے"۔

"تو پھر یہ شکایت بھی چھوڑ دیجئے کہ ہماری زندگی میں دلچسپی نہیں"۔

"اسکو پردے سے کیا تعلق"؟

"یہی تعلق ہی نہیں! جب تک پردہ ہے، عشقیہ شادی جس کے آپ اسقدر دلدادہ معلوم ہوتے ہیں ممکن ہی نہیں۔ وہاں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بڑھے تو ماں باپ نے جہاں اُن کا دل چاہا بیاہ دیا، چون وچرا کی گنجائش ہی نہیں؛ اور ہو بھی تو کیا۔ نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ بات کر سکتے ہیں۔ شادی کیا ہوئی سرکاری

نوکری ہوئی. جہاں سرکار کا دِل چاہا، نوکر کو بھیج دیا. حاکم کو ماتحت کی خبر نہیں، ماتحت کو یہ معلوم نہیں کہ حاکم کیسا ہوگا. اس زندگی میں رازِ سربستہ کیسے پیدا ہو سکتے ہیں اور فسانوں کا سا سلسلۂ راز آخر میں جاکر کھُل کیسے سکتا ہے. یہ سب سچّے عشق کی طفیل میں نصیب ہو سکتا ہے. روپیہ کے لئے شادی مت کیجئے، بلکہ عشق کے لئے اور پھر میرا دعویٰ ہے کہ ایک ایک لفظ ناولوں کا آپ کو صحیح معلوم ہوگا. لیجئے میری ہی سرگذشت سُنئے اور بتائیے کیا یہ ناول نہیں". یہاں نعیم یکایک رُک گیا، کچھ دیر تک متاثر حالت میں سگار کے دُھوئیں کو دیکھا کیا، گویا نظر وہاں ہے اور خیال کہیں اور پھر کہنے لگا: "کیا اس سے بھی بڑھ کے کوئی فسانہ ہو سکتا ہے".

میں نے بڑے اشتیاق سے کہا: "خدا کے لئے سناؤ". "سناؤں تو، مگر کیا میں سُنا سکوں گا"؟

میں نے ذرا چلا کے کہا: بلند! میرے اشتیاق کو مت بھڑکاؤ۔ کہو تو!"

"بھائی اصل یہ ہے کہ یہ سرگذشت ایسی نہیں (نعیم کی آواز یہاں رقت بھری تھی) کہ میں ٹھنڈے دل سے بیان کر سکوں۔ مجھے معاف کرنا اگر کہیں وارفتگی کی حالت طاری ہو جائے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب ہم تم کالج میں پڑھا کرتے تھے تو میں ہمیشہ ولایت جانے کی تمنا ظاہر کیا کرتا تھا۔ جب تم کالج چھوڑ کے چلے گئے، اُسکے کچھ دنوں بعد، والد مرحوم مجھے ولایت بھیجنے پر راضی ہو گئے۔ حیدرآباد میں تو نوکر تھے ہی، وہاں کوشش کر کے ریاست کی طرف سے مجھے بھجوا دیا۔ پانچ برس کی محنت شاقہ کے بعد، بفضلِ خدا میں ایم۔ ڈی ہو کر واپس آ گیا۔ اور ریاست میں سول سرجن مقرر کیا گیا۔ اس کے ایک سال بعد ہی والد ماجد کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ والد

مرحوم کی تمنا یہ تھی کہ میری شادی اُنکی زندگی ہی میں ہوجاتی،
مگر ہائے ایسے باپ کسے نصیب ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے کبھی
مجھ پر جبر نہیں کیا، اور اس امر کو میری مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔شادی
کے بارے میں میرے خیالات اُسوقت کچھ اور ہی تھے۔
اور مَیں اُن پر ہنستا تھا جو خواہ مخواہ شادی کر کے مُصیبت
میں پڑتے تھے اور اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے
مَیں کہتا تھا کہ اس سے بڑھ کر بھی کوئی غلطی نہیں ہوسکتی کہ
جان بُوجھ کر اِنسان اپنے پاؤں میں بیڑیاں ڈال لے۔ کیا
معلوم تھا کہ تھوڑے دنوں بعد، لوگ مجھ پر ہنسینگے۔ جو
شفاخانے میری زیرِ نگرانی تھے، اُن میں سے تین چار
زنانے شفاخانے بھی تھے اور یہ نہایت حیرت انگیز بات
تھی کہ اِن میں کی ایک ڈاکٹرنی مُسلمان تھی۔ آگرہ میں تعلیم
پائی تھی اور حیدر آباد مقرر ہو کر آئی تھی۔ چونکہ یہ بالکل ایک

نئی بات تھی اس لئے حیدرآباد میں اس مسلمان لیڈی ڈاکٹر کا
شہرہ تھا ۔ اور ہندوستانیوں کی بدگمانی ! آپ جانیں یہ
کسی کے حق میں کلمۂ خیر تھوڑا ہی کہینگے ۔ کسی کو اس کی
پاکدامنی میں شبہ تھا ، کوئی کہتا تھا جانے کس رذیل قوم کی
ہے ۔ غرضکہ جتنے منہ اتنی ہی باتیں تھیں ۔ لیکن اس کا
حسن سب کو خیرہ کئے ہوئے تھا ، کیونکہ وہ پردہ بالکل نہیں
کرتی تھی ۔ مجھ کو اپنے عہدہ کی حیثیت سے اکثر ملنے کا
اتفاق ہوتا تھا ، مگر اس رکھ رکھاو کی عورت میں نے کبھی
نہیں دیکھی ۔ چاہے اسے مزاج کی سنجیدگی کہئے ، یا غرورِ حسن
خیال کیجئے ، کچھ ہو ، نتیجہ یہ تھا ، کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ آنکھ
بھر کر دیکھ سکے ، کام اتنا عمدہ کہ کل ریاست کے زنانہ
شفاخانوں میں اس کا شفاخانہ اوّل رہتا تھا ۔ میرا یہ حال
تھا کہ اگر کوئی کہیں اس کی ذرا سی بھی بُرائی کرتا تو مجھے تاب

نہ رہتی تھی ۔ مَیں کہتا کہ یہ پہلی مثال ہے کہ اِک مُسلمان عورت نے ڈاکٹری اِمتحان پاس کیا اور وُہ پہلی مثال بھی اتنی عمدہ ہے، پھر بھی اُسے بُرا کہا جاتا ہے ۔ غرضکہ مَیں لوگوں سے اُس کی حمایت میں لڑا کرتا تھا ۔ تھوڑے دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ مجھے محض اس سے محبت ہی نہیں عشق ہے، کیونکہ روز بروز اُس کا خیال دِل میں گھر کرتا جاتا تھا ۔ اس خیال کو جتنا مَیں نے ہٹانا چاہا، اُتنی ہی زیادہ زور سے وُہ دِل میں متمکن ہوتا گیا مَیں اپنے دِل سے کہتا تھا کہ: "دُنیا کیا کہیگی؛ عزیز و اقارب کیا کہینگے"۔ دِل کہتا تھا کہ عشق میں اِن باتوں کا کیا خیال کیا یہ کافی نہیں کہ وُہ شریف ہے، نیک ہے، لاکھوں میں انتخاب ہے ۔ جب خُدا اور رسُول نہیں روکتے تو اَور روکنے والا کون ہوتا ہے"۔ مَیں انہیں خیالات میں مستغرق رہتا تھا اور کوئی تصفیہ نہیں کرسکتا تھا کہ مجھے معلوم نہیں کس طرح اور کس

بیخودی کی حالت میں ایک دن میں اس سے یہ کہہ گیا کہ "آپکی شادی ہوگئی ہے ؟ اور اگر نہیں تو کیا آپ کی زوجیت کی عزت مجھے حاصل ہوسکتی ہے ؟"

اُف ! اِس فقرہ کا اثر اُس پر کیسا ہوا ہے ؟ چہرہ یکایک تمتما اُٹھا ؛ آنکھیں جو حیاتِ رُوح کی بیزبان ترجمان ہیں، پُرغضب ہوگئیں اور نہایت غصّہ بھری آواز سے اُس نے مجھے جواب دیا: "جناب ! مَیں نہیں جانتی آپ کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔ آپ میرے افسر ہیں، مجھے آپ سے اس قسم کی باتوں کی اُمّید نہ تھی"۔

بجائے اس کے کہ مَیں اس جواب سے اپنے ہوش میں آتا، نہ معلوم وُہ کیا بات تھی کہ جس نے مجھے اَور بیخود کر دیا اور بیتاب ہوکر، نہایت عاجزی سے اِلتجا کرنے لگا۔ اُس دن مجھے یقین ہوا ہے کہ

عشق اوّل دردلِ معشوق پیدا میشود   گر نسوزد شمع کَے پروانہ شیدا میشود

جب میں اپنی جنُون آمیز گفتگو ختم کر چکا تو مجھے یقین تھا کہ شاید اسوقت عتاب کی اِنتہا نہ رہیگی لیکن میرے نصیب کہ اُس نے نہایت آہستگی سے کہا: "خود آپ خیال کیجئے کہ مَیں ایک معمُولی درجہ کی عورت ہُوں۔ آپ اللہ رکھے، اِتنے بڑے عہُدہ پر ہیں۔ کہاں مَیں، کہاں آپ۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ اپنی کوٹھی پر جائینگے تو آپ کہینگے کہ لاحول وُلاقوۃ۔ مجھ سے بھی کیا بیہودگی ہُوئی ہے۔ ایک ادنیٰ درجہ کی عورت سے کیا کیا باتیں کہی ہیں۔ اِس لئے مجھے میرے حال پر رہنے دیجئے۔" یہ جواب شاید تمہارے نزدیک مایوسی دلانیوالا ہو، مگر مجھ پر تو اُس نے اُلٹا اثر کیا۔ مَیں گھر گیا تو ان خیالات میں کمی کیسی، اُلٹا میں کسی کام کے قابل نہ رہا۔ اُٹھتے بیٹھتے یہی دُھن تھی کہ وُہ کسی طرح میرے التجا کو قبول کرے۔ میری یہ حالت کہ ضرورت ہو یا نہو، اُس کے شفاخانے کا مُعائنہ

ضرور کرنا ، اور کسی نہ کسی طرح عرض حال کرنا ۔ کچھ عرصہ کے بعد میں نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ اُس کی پہلی بھڑکیں بھی کم ہوتی گئی ۔ اور ۔ قصّہ کو طُول کیا دوں ۔ ایک دن وہ آیا کہ ہم اور وہ دُولہا اور دُلہن ہو گئے ۔ لیکن میری اور قمر النساء ۔ (یہ اُس کا نام تھا) کی شادی کوئی معمولی بات نہ تھی ۔ حیدرآباد بھر میں اس کا چرچا ہُوا ۔ اگرچہ ہم نے نہایت سادے طور پر شادی کی تھی ، مگر اپنی اپنی قسمت ہے ۔ کوئی ہزاروں روپیہ خرچ کرتا ہے اور دُھوم دھڑکے سے بیاہ رچاتا ہے تاہم شہرت اُس کی عُشرِ عشیر بھی نہیں ہوتی جو ہماری غریبی کی شادی کی ہوئی ۔ مگر جو سُنتا تھا ، کانوں پر ہاتھ دھرتا تھا ، ہم پر لعن طعن کرتا تھا ۔ ہم عیش سے زندگی بسر کرتے تھے ، کیا خبر تھی کہ ہم پر یُوں ظُلم ہوگا ؎

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے ... صیاد کی نگاہ سُوئے آشیاں نہیں

دُشمنوں نے ہمارے افسرِ بالا کے کان بھرے، اور
ایک دن مرگِ مفاجات کی طرح ہمارے پاس یہ حکم آیا کہ دونوں
حدودِ ریاست سے باہر ۴۸ گھنٹے میں نکل جائیں۔ ہم کر ہی
کیا سکتے تھے؛ سنگ آمد و سخت آمد۔ ہم اپنے قلیل التعداد
ہمدردوں کی افسوس، اور تیرہ دل دُشمنوں کی خوشیوں میں،
حیدرآباد سے رخصت ہوئے۔ قمر النساء نے مجھ سے آبدیدہ
ہوکر یہ کہا "دیکھا! میری وجہ سے تم پر یہ مصیبت نازل ہوئی"
لیکن مجھے بخُدا، ذرا بھی جو اس کا خیال ہو کہ مجھ پر یہ مصیبت ہے
مَیں اپنے تئیں دُنیا میں سب سے بڑا خوش قسمت سمجھتا تھا
کیونکہ میری قمر النساء میرے ساتھ تھی۔ مَیں حیدرآباد سے
سیدھا لکھنؤ پہنچا۔ اور یہاں مَیں نے اپنا مطب جاری کر دیا۔
سچ کہا ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ حیدرآباد سے یوں
نکلا، یہاں پہنچ کے بالکل نااُمیدی ہو گئی۔ کئی مہینے گذر گئے

اور آمدنی عنقا! اور ایک بم چلتی بھی کس کی ہے؟ یہ تو ایک سوداگری ہے۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ جب تک نہ ہو کون آتا ہے؟ اور میرے پاس کیا تھا؟ جب حیدرآباد میں رہا، کبھی کچھ پس انداز ہی نکیا، جس کا خمیازہ اب بھگتنا پڑا۔ کہتے ہوئے شرم آتی ہے مگر کہنا ہی پڑتا ہے۔ یہ حالت ہوگئی تھی کہ ایک ما ماتک رکھنے کی مقدرت نہ رہی۔ قمر النسا بیچاری ساری کام گھر کا کرتی تھی۔ اور جب میں گھر میں آتا تو نہایت خندہ پیشانی سے کہتی کہ" کھانا پکانا اور گھر کا کام کرنا مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا ہے"۔ اُس کا یہ کہنا گو وہ دل سے ہی ہوتا تھا، مجھ پر تیر کا کام کرتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ: "ہائے میں کمبخت ہی تو اس بیچاری پر ان مصیبتوں کے پڑنے کا باعث ہوا ہوں"!

خُدا کی شان، اسی زمانہ میں قمر النسا اُمید سے ہوگئی۔

اب تو مجھے بیحد فکر ہوگئی ؛ ہر وقت یہ خیال کہ ایسے ایسے سخت کام کرتی ہے، کہیں جھٹکا ٹوٹکا آ جائے تو اور مشکل پڑے۔ اِسی فکر میں رات دِن گھُلتا تھا، اَور کچھ کر نہ سکتا تھا۔ میرا کوئی رشتہ دار بھی نہ تھا کہ جس کے ہاں جا پڑتا، اور قمر النسا بھی کہتی تھی کہ "مَیں یتیم اور بالکل بے والی وارث ہُوں"۔ لیکن ایک دِن خود ہی اُس نے کہا کہ "پٹنہ میں میرے ایک دُور کے رشتہ دار ہیں، شاید وُہ زندہ ہوں، چلو وہیں چلیں"۔ مجھ کو اِس بات کا خیال کرتے بھی شرم آتی تھی کہ مَیں اُن کے ہاں جا کے پڑونگا، لیکن کیا کرتا، قمر النسا کی جان بھی پیاری تھی۔ گیا مگر با دِلِ ناخواستہ۔ جب ہم پٹنہ پہنچے، تو قمر النسا پتہ پُوچھتی ہُوئی ایک نہایت معمولی درجہ کے مکان میں مجھے لے گئی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر، ایک بزرگ صُورت باہر آئے۔ قمر النسا کو دیکھتے ہی نہایت متعجب ہُوئے، پھر خوشی

خوشی گھر میں لے گئے۔ گھر میں ایک بڑی بی تھیں، جو ہم دونوں پر صدقے ہوئیں اور قمر النسا سے کہنے لگیں کہ: "میری بھانجی! تمہیں تو ہم مُردہ خیال کر چکے تھے"۔ دو تین دن تک میں یہاں رہا۔ ایک دن قمر النسا کے خالو۔ ہمارے میزبان۔ نے مجھ سے کہا: "یہاں ایک نواب صاحب ہیں، میں اُنکی سرکار میں نوکر ہوں، چلئے آپ کو بھی اُن سے ملاؤں" پھر ایک نہایت عالیشان کوٹھی میں مجھے لے گئے، اور گول کمرے میں بٹھا کے کہا کہ "تم یہیں بیٹھے رہنا، میں ابھی آتا ہوں، نوّاب صاحب بھی اُسوقت تشریف لائینگے۔ محل میں ہیں"۔

میں اکیلا بیٹھا رہا۔ کوٹھی کی ایک ایک چیز کو دیکھتا تھا اور عش عش کرتا تھا، لیکن اک بات سے حیرت تھی: ساری کوٹھی میں سنّاٹا تھا، میں اِسی حالت میں تھا کہ یکایک سامنے

کا دروازہ کھُلا اور شاہزادیوں کے لباس میں ملبوس ایک
خاتون کمرے میں داخل ہوئی ۔ مَیں جھجک کے چاہتا تھا
کہ کمرے سے باہر نکل جاؤں اور اِس خیال سے میں باہر
کی طرف لپکا بھی کہ اُس خاتون نے کہا : "پیارے نعیم"
پھر کر جو غور سے دیکھتا ہوں تو میری پیاری قمر النّسا
بادشاہزادی بنی کھڑی ہے ؛ اور بیساختہ میری زبان سے
نکل گیا : "مَیں خواب دیکھ رہا ہوں ، یا میری آنکھیں دھوکا
دے رہی ہیں"۔

قمر النّسا نے ہنس کے کہا : "نہیں تم جاگتے ہو اور مَیں ہی
تمہاری قمر النّسا ہوں" ۔ اللہ اللہ ، مجھے تم پہچانتے بھی نہیں
(پھر میری طرف بڑھ کے اور گلے میں بانہیں ڈال کے) خُدا
کا شکر ہے کہ ہماری مُصیبتیں دُور ہوئیں ۔ میرے پاس بڑی
ریاست ہے اور ہم اب عُمر بھر یہیں رہینگے"۔

مَیں نے حیرت زدہ ہو کر پُوچھا "تو تم نے حیدر آباد میں نوکری کیوں کی تھی"؟ "سب بتاتی ہُوں، بے صبر کیوں ہوئے جاتے ہو۔ میرے والد مرحوم، نہایت روشن خیال آدمی تھے، اُنہوں نے میری تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی کی، اور کہتے تھے کہ اولاد کو تعلیم دینا، بس یہی والدین کا فرض ہے، سوائے میرے اُنکے کوئی اولاد نہ تھی! اور خُدا کی مرضی یہ ہُوئی کہ میرے بارہویں سال میں، اللہ بخشے ابا کا سایہ میرے سر سے اُٹھ جائے۔ ساری جائداد کی مَیں ہی مالک ہُوئی۔ مَیں نے اپنے سرپرست سے یہ کہا کہ مَیں ڈاکٹری پڑھونگی۔ چنانچہ مَیں آگرہ بھیجی گئی، وہاں سے آئی تو بڑے بڑے گھرانوں سے میرے لئے پیغام آئے، مگر مَیں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ جب تک کوئی مجھے صرف میرے لئے نہ بیاہیگا، مَیں کسی سے شادی نہ کرونگی۔ اِس لئے

غریب بنی اور حیدرآباد گئی اور صدقے اُس کی کریمی کے،
کہ اللہ نے تم جیسا پیارا خاوند مجھے دیا، جس نے مجھے
میری دولت کے لئے نہیں بیاہا، بلکہ صرف میرے لئے۔
ساری دُنیا مجھے بُرا کہتی تھی، میری طرف سے بدگمان تھی،
پھر بھی (میرا بوسہ لیکر) تم نے مجھ سے شادی کی اور مَیں نے
تمہارے ساتھ ساری مصیبتیں جھیلیں، صرف یہ دیکھنے کے
لئے کہ آیا تمہیں مجھ سے اصلی محبت ہی، یا اُکتا جاؤ گے۔ اپنی
کوٹھی پر، مَیں برابر حالات لکھتی رہتی تھی، اِس وجہ سے خالو
کو سب حال معلوم تھا؛

اِس کے بعد ہم ہنسی خوشی رہنے لگے"۔

یہ کہہ کے نعیم رُکا اور پھر بھرائی ہُوئی آواز سے کہنے
لگا: مشیّتِ ایزدی میں کس کو دخل ہے۔ آٹھ سال بعد اللہ
نے قمر النسار بھی مجھ سے چھین لی۔ اب وُہ جنّت میں ہی اور

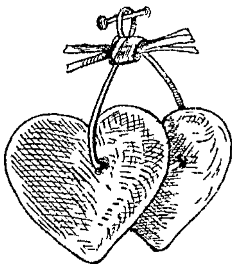
مَیں یہاں زندگی کے دن پُورے کر رہا ہُوں ۔ ایک اُسکی یادگار ہے اور وُہی میری زندگی کا سہارا ہی۔ یعنی میری پیاری ابنی نجم النسا جو ہمارے چلنے آنے کے پانچ مہینہ بعد دُنیا میں آئی تھی ۔ اللہ اُسے جیتا رکھے ۔ میری طبابت بھی یہاں خُوب چمکی اور اب میری ذاتی جائداد بہت کچھ ہی۔ اِس لئے میرا ارادہ ہی کہ قمر النسا کی جائداد کسی کارِ خیر کے لئے وقف کر دوں ۔

عزم یہ ہے کہ کل جائداد عورتوں کی تعلیم کے واسطے وقف کر دوں ؛ جب محمڈن یونیورسٹی بنے تو ایک کالج خاص طور پر مُسلمان خاتونوں کے لئے تیار کیا جائے ۔ ایک لاکھ کی جائداد ہے ۔ میرے خیال میں کالج کے ابتدائی اخراجات کے لئے کافی ہوگی ۔ تمہاری کیا رائے ہے"۔ مَیں نے کہا "ضرور واللہ ضرور ۔ خُدا تمہارے ارادے میں برکت دے ۔ کل قوم احسانمند ہوگی ۔ مگر شب بخیر، نیتِ شب حرام ۔ چلئے رات

بہت آئی ہے۔ لو ایک بجگیا۔ اب چل کے سونا چاہیئے"۔
یہ کہہ کے ہم کوٹھی میں داخل ہوئے۔ اب کوٹھی کی ایک ایک چیز مجھے عجیب معلوم ہوتی اور میرے دل پر عجیب اثر ڈالتی تھی۔

ہے یوں کہ ؎

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے
دو روزہ عمر کو انساں نہ رائگاں کاٹے



مرزا پھویا علی گڑھ کالج میں

ہو وطن سے کبھی جُدا نہ کوئی — گھر سے بے گھر ہوا ے خدا نہ کوئی
دردِ غربت سہا نہیں جاتا — رنجِ فرقت کہا نہیں جاتا
یاد احباب کی جو آتی ہے — دل میں اک درد سا اُٹھاتی ہے
بی بی بچوں کا آگیا گر دھیان — سینہ کوبی سے ہو گئے ہلکان
گھر کے نقشہ کا دل میں پھر جانا — اُسکا سو سو جتن سے پھر جانا!
گھر سے بے گھر جو کوئی ہو جائے — عیش و آرام اُس کا کھو جائے
نئی دُنیا بشر نیا دیکھے — گویا عالم ہی دُوسرا دیکھے
الغرض یہ مصیبت ایسی ہے — ساری دُنیا کے غم ہیں کم جس سے



اب سنیں صاحبانِ ہوش و ذکا — اک نیا ماجرا، نیا قصّہ

ایک صاحب اودھ میں رہتے تھے — مرزا پھویا، سب اُنکو کہتے تھے

کیا کہوں تھا کہاں چمن اُن کا — لکھنؤ تھا کبھی وطن اُن کا

گھر سے نکلے نہ تھے تمامی عُمر — ساری بھونسرے ہی میں گذاری عُمر

اپنے ماں باپ کے دُلارے تھے — اور عزیزوں کے وُہ پیارے تھے

خیر سے تھا ابھی شباب شروع — عُمر کا بیسواں تھا باب شروع

رات دِن کھیلتے گھر پھرتے — سارے گھر والے "بچّہ" کہتے تھے

باتیں کرنے میں بھی لجاتے تھے — غیر شخصوں سے سہم جاتے تھے

عیش سے دِن مگر گذرتے تھے — نہ کسی کا خیال کرتے تھے

چین تھا دِن کو لُطف راتوں میں — وقت کٹتا تھا یوں ہی باتوں میں

کہ فلک ہوگیا خلل انداز — تجھ سے سمجھے خُدا ارے مباز

دُور پھینکا وطن سے ہائے غضب! — آخر اس دشمنی کا کوئی سبب؟

اس کی تفصیل اس طرح سُنیے — دردِ مرزا کی پھر دوا کیجے

قوم میں سب سے اعلیٰ و اولیٰ — مُحسن الملک مُحسن الدولہ

دردِ قومی کے اس معالج نے — یعنی سیکرٹری کالج نے

اپنے احباب کی معیت سے — اور مشاہیر کی جماعت سے

سارے شہروں کا جب کیا دورہ — لکھنؤ بھی مشرّف اس سے ہوا

دُھوم تھی اک فصیح آیا ہے — نیچری فوج ساتھ لایا ہے

وقتِ تقریر اُس کا طرزِ بیاں — گہ شرر بار گاہ نور فشاں

جادو کرتا ہے، سحر کرتا ہے — مہر کرتا ہے، قہر کرتا ہے

گہ ہنساتا ہے، گہ رلاتا ہے — کچھ عجب ڈھنگ اُسکو آتا ہے

جب ہوئے اُنکے سارے دوست مستفید — تب تو مرزا کے والدِ ماجد

جا کے جلسے میں خود شریک ہوئے — سارے لکچر بغور اُنہوں نے سُنے

کر گیا اُن پہ جادو اپنا کام — تھا علیگڈھ کا ہی زباں پر نام

ایک دم یہ تہیہ کر بیٹھے — بس علیگڈھ میں مرزا جا کے پڑھے

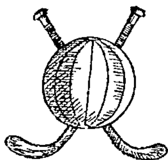
اِس ارادہ کو جب کہا گھر میں پڑ گیا رونا پیٹنا گھر میں
چیخی مرزا کی ماں کہ: "ہائے ہائے! کوئی جا کر ذرا اُنہیں سمجھائے
اِنکو تو ہو گیا ہے کچھ سودا سوچتے ہی نہیں بُرا و بھلا
میرا بچہ نہ جائے گا کوئل میرا آتھر کا تو نہیں کچھ دل"
نہ اُنہوں نے سُنی کسی کی بھی اپنی ضد ہر طرح سے پُوری کی
دیدیا حکم: "جائے مرزا کل" ہائے! یہ حکم تھا پیامِ اجل
جُوں جُوں ہوتی سفر کی تیاری اُنپہ ہوتی تھی زندگی بھاری
آگیا وقت وُہ بھی آخرِ کار ڈرسے آتا تھا جسکے اِنکو بُخار
وقتِ رخصت تھا سخت مرزا کو چاہتے تھے، مرُوں یہیں پھوڑ کے سر
کچھ بھی لیکن نہ کرتے دھرتے بنا باپ نے جو کہا، اُنہوں نے کیا

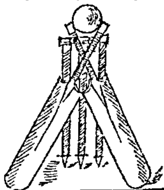
شور و شیون تمام کرنے کو گھر میں آئے سلام کرنے کو
اِنکے آتے ہی مچ گیا کُہرام روتا تھا، ایک ایک دل کو تھام

خالہ اماں، مومانی، بھابی جان — اپنے مرزا پہ سب ہوئیں قربان
آپا جانی نے بھی بلائیں لیں — سب نے مل مل کے یوں دعائیں دیں
"یا الٰہی! یہ خیریت سے پھرے — اور دشمن پہ اس کے بجلی گرے
واسطہ مرتضیٰ علی کا تجھے — جلد لا کر ملائیو ہم سے"
اشک برسا کے دیدۂ تر سے — کیا کہوں مرزا چل دیئے گھر سے
مختصر یہ پہنچ گئے وہ یہاں — آہ برلب، درونِ سینہ فغاں
ایک ہفتہ تو کاٹا رو دھو کر — بعدہٗ ہر طرح سے رنج ہو کر
اک عریضہ کی یوں بنا ڈالی — "قبلہ ام مدظلہ العالی
اوّلاً مجرا عرض کرتا ہوں — حال پھر اپنا عرض کرتا ہوں
ہو کے رخصت جناب سے پہنچا — کیا کہوں اس جگہ پہ کیا دیکھا
یاں کے لڑکوں کا حال ہی ہے جدا — ایسا دیکھا کبھی، کبھی نہ سنا
جنس ہر اک نئی، دکان نئی — اور تو اور، ہے زبان نئی
"اک دال"[1] "اک گوشت" کہتے ہیں — جانے کس دیس میں یہ رہتے ہیں

[1] یہ اصطلاحات وہ ہیں جو میرے زمانہ میں علی گڑھ میں رائج تھیں۔ غالباً اب بھی ہونگی۔ چونکہ [illegible] مرزا پھویا میرے زمانہ میں کالج میں تشریف لائے تھے، لہٰذا انہیں اصطلاحات کا ذکر کیا گیا

ہوں پریشاں تو آلیا، فرمائیں — خوش ہوں گر تو ہیر پھیر یہ سنائیں
گر ہو اچھا لباس ٹھاٹ کہیں — اور گنواروں کو راج گھاٹ کہیں
بو تغم کی ہو ذرا سی بھی — اسکو کہتے ہیں، یا نپہ عیاشی
عمدہ کھانا کھلانا عیاشی! — عمدہ شربت پلانا عیاشی!
عطر میں گر کبھی جو کپڑے بسائیں — فوراً عیاش آپ کہلائیں
کورنش، مجرا، بندگی، آداب — سب کی یاں ہو گئی ہے مٹی خراب
اِنکے بدلے ہے بس سلام علیک — گویا لے ڈھیلا کھینچ مارا ایک
دوڑتے، کودتے، اُچھلتے ہیں — بھول کر بھی نہ سیدھے چلتے ہیں
کوئی مارے پھلانگ تو یہ خوش! — ٹوٹ جائے جو ٹانگ تو یہ خوش!
گیند بلا سواری اور فٹ بال — یہ یہاں کے ہیں کھیل، یہ اشغال





گر پڑے گر کوئی تو خوش ہو ئیں	اور پھر خوب خوب تالی بجائیں
صبح ہوتے ہی کرتے ہیں ڈرِ میل	نہ جبیں پر شکن، نہ دل پر میل
صبح تڑکے، ڈرل کراتے ہیں	ایسے بیرحم ہیں تھکاتے ہیں
جو قواعد کراتے ہیں سب کو	کیا دعا دوں میں ایسی پڈھب کو
ڈانٹ کر وہ بلاتے ہیں مجھ کو	اپنا غصہ دکھاتے ہیں سب کو
ہو گئی میری جان بھی بیکل	جب وہ چیخے: "بریک ان ٹو ڈِل"
حکم ہے وقت پر ہی کھانا کھاؤ	شام کو اک جگہ جمع ہو جاؤ
بھوک ہو یا نہ ہو نہیں پروا	ہے اسی وقت تہو رنا پڑتا
یاں کی آزادی ہو بہت محدود	شہر جانا بھی ہو گیا مسدود
اس لئے عرض ہو کہ یہ چیزیں	لکھنؤ سے روانہ آپ کریں
اک ڈبیہ دیا سلائی کی	پڑیا اک نیلی روشنائی کی
اک برش جوتہ صاف کرنیکا	اور برانکو بھی ساتھ تھوڑا سا
بوٹ کے لیس کی ضرورت ہو	اور موزے بھی چند اچھے سے

دو گھڑے، اک صراحی، پیالے چار   اور ممکن ہو گر تو تھوڑا اچار
اور باقی تو خیریت ہی سب
سب کو تسلیم، زیادہ حد ادب"۔

کے بندو میری سنو، میں غریب الوطن ہوں"۔
فقیر تو یہ کہتا ہوا اور جن پر اُس کے قصّہ کا اثر ہوا، اُنکی خیرات لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے اور میں نے اپنی حالت کا مقابلہ اُس سے کیا اور مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر امور میں میں نے اُسکو اپنے سے اچھا پایا۔ یہ صحیح ہی کہ میں کام کرتا ہوں اور وہ مفت خوری سے دن گذارتا ہے۔ نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے وہ جاہل ہے۔ میں اچھے لباس میں رہتا ہوں وہ پھٹے کپڑے پہنتا ہے، بس یہانتک میں اُس سے بہتر ہوں۔ آگے بڑھ کر اُس کی حالت مجھ سے بدرجہا اچھی ہے۔ اُس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہئیے، میں رات دن فکر میں گذارتا ہوں اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ باوجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے

کے اس کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی۔ بڑی دیر تک مَیں غور کرتا رہا کہ اُس کی یہ قابلِ رشک حالت کس وجہ سے ہے؟ اور آخر کار مَیں۔ اس بظاہر عجیب نتیجہ پر پہنچا کہ جسے وُہ مُصیبت خیال کرتا ہے، وُہی اُس کے حق میں نعمت ہی۔ وُہ حسرت سے کہتا ہے کہ "میرا کوئی دوست نہیں" مَیں حسرت سے کہتا ہوں: "میرے اِتنے دوست ہیں" اُس کا کوئی دوست نہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو اُسے مُبارکباد دینی چاہئے۔

مَیں اپنے دِل میں یہ باتیں کرتا ہوا، مکان پر آیا: "کیسا خوش قسمت آدمی ہے کہتا ہے، میرا کوئی دوست نہیں۔ اَے خوش نصیب شخص! یہیں تو تو مجھ سے بڑھ گیا لیکن کیا اس کا یہ قول صحیح بھی ہی؟ یعنی کیا اصل میں اس کا کوئی دوست نہیں جو میرے دوستوں کی طرح اُسے دِن بھر

میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے؟ میں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جا رہا ہوں مگر خبر نہیں کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملیگا کہ میں تخلیہ میں اپنے خیالات جمع کرسکوں اور اُنھیں اطمینان سے قلمبند کرسکوں ؛ یا جو اسپیچ مجھے کل دینی ہے اُسے سوچ سکوں ۔ کیا یہ فقیر دن دہاڑے اپنا روپیہ لیجا سکتا ہے اور اُس کا کوئی دوست راستے میں نہ ملیگا اور یہ نہ کہیگا "بھائی جان ! دیکھو پُرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہُوں ، مجھے اس وقت ضرورت ہی ، تھوڑا سا روپیہ قرض دو" ۔ کیا اس کے احباب ، وقت بیوقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچکر نہیں لیجاتے ۔ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اُسے نیند کے جھونکے آرہے ہوں ، مگر یار دوستوں کا مجمع ہی جو قصّہ پر قصّہ اور لطیفہ پر لطیفہ کہہ رہے ہیں مگر اُٹھنے کا نام نہیں لیتے ؟ کیا اسے دوستوں

کے خطوں کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اس کے پیارے
دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں جو اُسے خواہ مخواہ
پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا پڑے؟ کیا اسے احباب کی
وجہ سے شور مچانا اور ہُو حق کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے
ہاں مُلاقات کو اُسے جانا نہیں پڑتا اور اگر نہ جائے تو کوئی
شکایت نہیں کرتا؟ اگر ان سب باتوں سے وُہ آزاد ہے
تو کوئی تعجب نہیں کہ وُہ ہٹا کٹا ہے اور مَیں نحیف و نزار ہُوں۔
یا اللہ! کیا اس پر بھی شکر ادا نہیں کرتا؟ خُدا جانے وُہ اَور
کونسی نعمت چاہتا ہے؟" لوگ کہینگے کہ اس شخص کے کیسے
بیہودہ خیالات ہیں! بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہوتی
ہے اور یہ اُن سے بھاگتا ہے۔ مگر مَیں دوستوں کو بُرا نہیں
کہتا، مَیں جانتا ہُوں کہ وُہ مجھے خوش کرنے کے لئے میرے
پاس آتے ہیں اور میرے خیر طلب ہیں، مگر عملی نتیجہ یہ ہے کہ احباب

کا ارادہ ہوتا ہی مجھے فائدہ پہنچانیکا اور ہو جاتا ہے مجھے نقصان۔ چاہے مجھ پر نفرین کیجائے مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آجتک میرے سامنے کوئی یہ ثابت نہ کر سکا کہ احباب کا ایک جمِ غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہی۔ میں تو یہانتک کہتا ہوں کہ اگر دُنیا میں کچھ کام کرنا ہے اور باتوں ہی میں عُمر نہیں گذارنی ہے تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑیگا، چاہے اِس سے میرے دِل پر کیسا ہی صدمہ ہو۔

مثلاً میرے دوست احمد مرزا ہیں، جنہیں میں بھڑ بھڑیا دوست کہتا ہُوں؛ یہ نہایت معقُول آدمی ہیں اور میری اُنکی دوستی نہایت پُرانی اور بے تکلّفی کی ہی، مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہی کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئینگے، شور مچاتے ہُوئے؛ چیزوں کو اُلٹ پلٹ

کرتے ہوئے۔ غرضکہ اِن کا آنا بھونچال کے آنے سے کم نہیں ہی۔ جب وُہ آتے ہیں تو مَیں کہتا ہُوں "کوئی آ رہا ہی قیامت نہیں ہی"۔ اِن کے آنے کی مجھے دُور سے خبر ہوجاتی ہے۔ باوجودیکہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ چھت پر ہے۔ اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ "میاں! اس وقت کام میں بہت مشغول ہیں"۔ تو وُہ فوراً چیخنا شروع کر دیتے ہیں، کہ "کمبخت کو اپنی صحت کا بھی تو کچھ خیال نہیں (نوکر کی طرف مخاطب ہوکر) خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے؟ توبہ توبہ! اچھا بس میں ایک منٹ ان کے پاس بیٹھوں گا۔ مجھے خود جانا ہے۔ چھت پر ہونگے؟ میں پہلے ہی سمجھتا تھا"۔

یہ کہتے ہُوئے وُہ اوپر آتے ہیں اور دروازہ کو اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولہ آکے لگا، (آج تک اُنہوں نے

دروازہ کھٹکھٹایا نہیں) اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں:
"اہا ہا ہا! آخر تمہیں میں نے پکڑ لیا، مگر دیکھو دیکھو میری
وجہ سے اپنا لکھنا بند مت کرو، میں ہرج کرنے نہیں آیا۔
خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا ہے! کہو طبیعت تو اچھی ہے؟
میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ مجھے کس قدر خوشی
ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ہے جو مضمون نگار
کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔ لو اب جاتا ہوں میں
بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا، تمہاری خیریت
دریافت کرنی تھی؛ خدا حافظ"۔ یہ کہہ کے وہ نہایت محبت
سے مصافحہ کرتے ہیں، اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ
کو اس قدر دبا دیتے ہیں کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور
میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علیحدہ رہا؛ اپنے ساتھ میرے
کل خیالات کو بھی لیجاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش

کرتا ہوں مگر اب وُہ کہاں ؟ اور دیکھا جائے تو میرے کمرے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہے۔ تاہم وُہ اگر گھنٹوں رہتے تو اس سے زیادہ نقصان نہ کرتے۔ کیا میں اُنہیں چھوڑ سکتا ہوں ؟ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میری اور انکی دوستی بہت پُرانی ہے اور وُہ مجھ سے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں، تاہم میں اُنہیں چھوڑ دُونگا۔ ہاں، چھوڑ دُونگا، اگرچہ کلیجہ پر پتھر رکھنا پڑے۔

اور لیجئے، دُوسرے دوست محمد تحسین ہیں۔ بال بچوں والے صاحب ہیں اور رات دن انہیں کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں، جب مَیں کام سے تو فارغ ہو چکتا ہوں لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایک گھنٹہ آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں، مگر تحسین آئے ہیں اور اُن سے ملنا ضروری

ہے۔ اُن کے پاس باتیں کرنے کے لئے، سوائے اپنی بیوی بچّوں کی بیماری کے اَور کوئی مضمون ہی نہیں۔ مَیں کتنی ہی کوشش کروں۔ مگر وُہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر مَیں موسم کا ذکر کرتا ہُوں تو وُہ کہتے ہیں ہاں بڑا خراب موسم ہے، میرے چھوٹے بچّے کو بُخار آگیا، منجھلی لڑکی کھانسی میں مُبتلا ہے۔ اگر پالٹیکس یا لٹریچر کے متعلّق گفتگو شروع کرتا ہوں تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ بھائی آجکل گھر بھر بیمار ہے، مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں۔ اگر کسی عام جلسہ میں آتے ہیں تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لئے ہوتے ہیں اور ہر ایک سے بار بار پُوچھتے رہتے ہیں کہ "طبیعت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں معلوم ہوتی؟" کبھی کبھی نبض بھی دیکھ لیتے ہیں اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری ہی کا ذکر کرتے ہیں۔

اِسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں، جنہیں اپنی ریاست
کے جھگڑوں، اپنے فریقِ مخالف کی بُرائیوں، اور جج صاحب
کی تعریف یا مذمت کے (تعریف اس حالت میں جبکہ
اُنہوں نے مقدمہ جیتا ہو) سوا اور کوئی مضمون نہیں.
منجملہ اور بہت سے مختلف قسموں کے دوستوں کے،
مَیں محمد شاکر خاں صاحب کا ذکر خصوصیت سے کرونگا،
کیونکہ وُہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں. شاکر خاں صاحب
موضع سلیم پور کے رئیس اور ضلع بھر میں نہایت معزز آدمی
ہیں. اُنہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق
ہے. لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں، جتنا لٹریری آدمیوں
سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا. اُنکا خیال ہی کہ اہلِ علم
کی تھوڑی سی قدر کرنا، اُمرا کے شایانِ شان ہی. ایک
مرتبہ میرے ہاں تشریف لائے اور بہت اصرار سے

مجھے تسلیم پورے گئے یہ کہہ کے کہ:

"شہر میں رات دن شور وشغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصہ رہنے سے تبدیلِ آب وہوا بھی ہو گی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کرسکو گے میں نے ایک کمرہ خاص تمہارے واسطے آراستہ کرایا ہے جس میں پڑھنے لکھنے کا سب سامان مہیا ہے۔ تھوڑے دِن رہ کے چلے آنا۔ دیکھو! میری خوشی کرو"۔

میں ایسے محبت آمیز اصرار پر انکار کیسے کرسکتا تھا؟ مختصر سا سامان پڑھنے لکھنے کا لیکر میں اُن کے ساتھ ہو لیا۔ اڈیٹر "معارف" سے وعدہ کر چکا تھا کہ ایک خاص عرصہ میں اُنکی خدمتمیں ایک مضمون بھیجوں گا۔ شاکر خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچکر میں نے وُہ کمرہ دیکھا جو میرے لئے تیار کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کی دُوسری

منزل میں تھا اور نہایت خوبی سے آراستہ تھا۔ اس کی
ایک کھڑکی پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی، اور ایک
نہایت ہی دلفریب نیچرل منظر میری آنکھوں کے سامنے
ہوتا تھا۔ صبح کو میں نیچے ناشتہ کی غرض سے بلایا گیا،
جب دوسرا پیالہ چائے کا پی چکا تو اپنے کمرے جانے
کے لئے اٹھتا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے
لگا کہ "ہیں! ہیں! کہیں ایسا غضب نہ کرنا کہ آج ہی سے
کام شروع کردو۔ اپنے دماغ کو کچھ تو آرام دو! اور آج کا
دن تو خاصکر اس قابل ہے کہ سینری کا لطف اٹھانے
میں گذارا جائے۔ چلئے گاڑی تیار کراتے ہیں، دریا
پہ مچھلی کا شکار کھیلینگے۔ پھر وہاں سے دو میل پر احمد نگر ہے
آپ کو وہاں کے رئیس راجہ طالب علی صاحب سے
ملائیں گے"۔

......تن، تنتن، تنتنانا، چھن، تاتن، تن تن تن—
میں ایسا مصروف تھا کہ دُنیا اور مافیہا کی خبر نہ تھی، یکایک
اس تن تن نے چونکا دیا! ہیں یہ کیا ہے؟ افوہ!
اب مَیں سمجھا، میرے کمرے کے قریب
نثار خاں صاحب کے چھوٹے بھائی کا کمرہ ہے! انہیں
موسیقی میں بہت دخل ہے. اس وقت ستار سے شوق
فرما رہے ہیں. بہت خوب بجا رہے ہیں:

"اُس کی گلی سے آئے کیوں؟ نگہت زلف لائے کیوں؟
مجھ کو صبا سے ہے اُمید، اہا مجھ کو صبا سے ہے امید،
مجھ سے صبا کو کیا غرض"

واہ وا! سُبحان اللہ کیا غزل چھیڑی ہے.

"اے تُرک سوار نواحِ عرب! یثرب نگری پہنچا دینا
کس رنگ میں ہے وُہ حبیب مرا، مجھے واکی خبر یالا دینا"

بہت ہی خوب! کمال کرتے ہیں۔
کوئی آدھ گھنٹہ اُنہوں نے موسیقی کی مشق فرماکر، مجھے میری خواہش کے خلاف محظوظ فرمایا۔ پھر کسی وجہ سے وہ اپنے کمرے سے چلے گئے، اور خاموشی طاری ہوگئی، تو مجھے پھر اپنے کام کا خیال آیا۔
"اے میرے خیالات، تمہیں میرا گنجینہ، میرا خزانہ ہو، خدا کے لئے رحم کرو، میرے دماغ میں پھر آجاؤ"
یہ کہہ کے میں کاغذ کی طرف متوجہ ہوا کہ دیکھوں کہاں چھوڑا ہے۔ میں اس فقرہ تک پہنچا تھا:
"ہم اس وسیع اور دقیق مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں اتنا ہی اُس کی مشکلات کا مثل"۔
مثل کے آگے میں کیا لکھنے والا تھا؟ ریگ دریا کے اندازہ نہیں کرسکتے؟ ہرگز نہیں۔ ایسا معمولی فقرہ تو نہ تھا،

مجھے یقین ہے کہ کچھ اَور تھا، کوئی اعلیٰ درجہ کی تشبیہ تھی اور فقرہ کو نہایت شاندار الفاظ میں ختم کرنیوالا تھا، خُدا ہی جانتا ہے کہ کیا تھا کیا نہ تھا، اب تو دماغ میں اُس کا پتہ بھی نہیں۔ گانے والے صاحب تو شکایت کر رہے تھے کہ:

"اُسکی گلی سے آئے کیُوں؟ نگہتِ زلف لائے کیُوں؟
مجھ کو صبا سے ہی اُمّید، مجھ سے صبا کو کیا غرض؟"

مگر میرا تو صَبَا کے نام سے نے دماغ خالی کر دیا، اگر وُہ آتی اور نگہتِ زُلف بھی لاتی تو نمعلوم کیا ہوتا۔ بہرحال اب مجھے وُہ فقرہ از سرِ نو درست کرنا چاہیئے "مشکلات کی بجائے کچھ اَور ہونا چاہیئے۔

"ہم اس وسیع مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں، اُتنا ہی ان بیش بہا، علمی جواہر کو جو ہمارے مُلک اور قوم کے

علمی خزانہ کے پُر کرنے کے لئے کافی ہیں اور جنکی قدر آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے؟

"جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے اتنے دنوں کہاں رہے"؟ یہ کیا مہمل فقرہ ہوا! لاحول ولاقوۃ۔ میں بھی کیا گڑبڑ کر رہا ہوں۔ "آپ کہاں بھول پڑے اتنے دنوں کہاں رہے"۔ یہ فقرے تو شاکر خاں صاحب نے کسی دوست سے کہے ہیں جو ابھی اُن سے ملنے آیا ہے۔ مَیں مصروفیت میں انہیں ہی لکھ گیا۔

ہاں تو کاٹ کے فقرہ درست کرنا چاہیئے:۔ "اور جنکی قدر ابھی تک مُلک و قوم کو معلوم نہیں ہوئی ہے اور انظار"

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

"کون ہے"؟

"مَیں ہوں شبّن۔ سرکار نے کہا ہے کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو

تو نیچے ذرا سی دیر کے لئے تشریف لائیے، کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں اور سرکار انہیں آپ سے ملانا چاہتی ہیں"

با دلِ ناخواستہ میں اُٹھا اور نیچے گیا۔ ثنا کر صاحب کے دوست، راجہ طالب علی صاحب تشریف لائے تھے، اُن سے میرا تعارف کرایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وُہ تشریف لیگئے اور مجھے بھی فرصت ملی، اور میں نے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ نبیّن نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ میری پھر یاد ہوئی! ہمارے میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دکھایا جاؤنگا، گویا میں بھی مثل اُس عربی گھوڑے کے تھا جسے میرے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کے دکھایا جاتا تھا۔ ان دوست سے نجات پاکر اور بھاگ کر میں پھر اپنے کمرے میں آیا۔ خیالات پھر

غائب ہوگئے تھے، فقرہ از سرِ نو پھر بنانا پڑا، طبیعت اُچاٹ ہوگئی، بہزار دِقت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا اور میں لکھ رہا تھا:

ہم کو کامل یقین ہے کہ ہمارے مُلک کے قابل نوجوان جنہیں تفتیش اور تحقیقات کا شوق ہے اور جو کولمبس کی طرح نئی معلومات اور نئی دُنیا (گو وُہ علمی دُنیا ہی کیوں نہ ہو) کے دریافت کرنے کے لئے اپنے تئیں"۔

دروازہ پر پھر دستک۔

"کیا ہے"؟

"حضور کھانا تیار ہے، میز پر چُنا جا چکا ہے"۔

"اچھا"

دریافت کرنے کے لئے اپنے تئیں خطرہ میں ڈالنے

سے بھی خوف نہیں کھاتے، ضرور اس طرف متوجہ ہونگے اور اپنی کاوشوں اور کوششوں سے موجودہ"

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔

"ہاں"۔

"حضور! سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے"

"افوہ! مجھے خیال نہیں رہا۔ سرکار سے عرض کرنا میرا انتظار نہ کریں، میں پھر کھا لونگا۔ اسوقت مجھے کچھ ایسی بھوک نہیں۔ اور آئندہ نسلوں کو زیر بار احسان کرینگے۔ یہی وہ نوجوان ہیں جو قوم کی کشتی کو، خدا کی مدد پر بھروسہ کر کے، خطرات سے بچاتے اور ساحل مراد تک پہنچاتے ہیں۔ زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ"

دستک۔

"کیا ہے" ؟
"سرکار کہتے ہیں اگر آپ تھوڑی دیر میں کھائینگے تو ہم بھی اُسی وقت کھائینگے ؛ مگر کھانا ٹھنڈا ہو کے بالکل خراب ہو جائے گا"۔

اچھا بھائی ، لو ابھی آیا"
یہ کہ کے مَیں کھانے کے لئے جاتا ہُوں ، سب سے معذرت کرتا ہوں ، میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ہیں : "چہرے پر تھکن معلوم ہوتی ہی . کیا بہت لکھ ڈالا ، دیکھو مَیں تم سے کہتا تھا نا کہ شہر میں ایسی فرصت اور خاموشی کہاں" ! سوائے اس کے کہ آمنّا اور صدّقنا کہوں اَور کیا کہہ سکتا تھا ؟ اب کھانے پر اصرار ہوتا ہی ، جس چیز سے مجھے رغبت نہیں وُہی کھلائی جاتی ہی . بعد کھانے کے ، میزبان صاحب فرماتے ہیں : "سہ پہر کو تمہیں گاڑی پر

چلنا ہوگا. میں تمہیں اس واسطے یہاں نہیں لایا کہ سخت دماغی کام
کرکے اپنی صحت خراب کرلو." واپس کمرے میں آکر میں تھوڑی
دیر اس غرض سے لیٹتا ہوں کہ خیالات جمع کرلوں اور پھر لکھنا
شروع کردوں. مگر اب خیالات کہاں؟ مضمون اُٹھا کر
دیکھتا ہوں: "زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ"! اس کے متعلق
کیا لکھنے والا تھا؟ اِن الفاظ کے بعد کونسے الفاظ دماغ میں
تھے؟ اب کچھ خیال نہیں کہ اسکو پہلے فقروں سے کیونکر
ربط پیدا کرنا تھا. یُوں ہی پڑے پڑے نیند آجاتی ہے.
تیسرے پہر اُٹھتا ہوں تو دماغ نہایت صحیح پاتا ہوں. "زندگی
اور موت کا لاینحل مسئلہ" بالکل حل ہوجاتا ہے. پُورا فقرہ آئینہ
کی طرح صاف نظر آتا ہے. میں خوشی خوشی اُٹھ کر میز پر گیا اور
لکھنا چاہتا تھا کہ پھر وہی دستک!

نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے، سرکار کپڑے پہنے

آپ کا انتظار کر رہے ہیں، مَیں فوراً نیچے جاتا ہُوں تو پہلا فقرہ جو میزبان صاحب کہتے ہیں یہ ہوتا ہے: "آج تو دستے کے دستے لکھ ڈالے"، مَیں سچّی بات کہوں کہ "کچھ بھی نہیں لکھا" تو وُہ ہنس کے جواب دیتے ہیں کہ "آخر اس قدر کسرِ نفسی کی کیا ضرورت ہے؟ خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھائیے قسمیں مجھے یقین ہُوا اور مجھکو اعتبار آیا"۔

رل مل کر شام کو واپس آئے، کھانے کے بعد باتیں ہوتی ہیں۔ سونے کے وقت اپنا دن بھر کا کام اُٹھا کر دیکھتا ہوں تو ایک صفحہ سے زیادہ نہیں، وُہ بھی بے ربط و بے سلسلہ۔ غصّہ اور رنج میں آکر اُسے پھاڑ کر پھینکدیتا ہوں اور دوسرے روز اپنے میزبان کو ناراض کر کے، اپنے گھر واپس چلا آتا ہوں۔ مَیں ناشکرا اور احسان فراموش کہا جاؤنگا، مگر مَیں مجبور ہوں اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ دُونگا۔

مَیں نے ذرا تفصیل سے اُن کا حال بیان کیا ہی، مگر یہ خیال نہ کرنا کہ یہیں اُن احباب کی فہرست ختم ہو گئی جن سے مَیں رُخصت طلب کر سکتا ہوں۔ نہیں ابھی بہت سی باقی ہیں۔ مثلاً ایک صاحب ہیں جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے، مگر جب آتے ہیں مَیں اُن کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔ یہ حضرت ہمیشہ قرض مانگنے کے لئے آتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو ہمیشہ ایسے وقت آتے ہیں جب مَیں باہر جانیوالا ہوتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں جب مجھ سے ملتے ہیں کہتے ہیں: "میاں! عرصہ سے میرا دِل چاہتا ہی تمہاری دعوت کروں" مگر کبھی اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوست ہیں، وہ آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں، جب مَیں جواب دیتا ہوں تو متوجّہ ہو کر نہیں سُنتے۔ یا اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں، یا گانے لگتے ہیں۔

ایک صاحب ہیں، جو جب آتے ہیں اپنی ہی کہے جاتے ہیں، میری نہیں سُنتے۔

یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں۔ مگر میں اپنی طبیعت کو کیا کروں، صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر اک سے کہہ سکتا ہوں:

"مجھ پہ احساں جو نکرتے تو یہ احساں ہوتا"

اب چونکہ میں نے یہ حال لکھنا شروع کر دیا ہی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اور احباب کے متعلق اپنے دلی خیالات ظاہر کروں دروازے پر ایک گاڑی آ کے رُکی ہی ایں سمجھ گیا کہ کون صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں اُنکی شکایت نہیں کرنیکا، کیونکہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہی کہ تین گھنٹہ سے میں یہ مضمون لکھ رہا تھا اور کسی کرمفرما نے کرم نہیں فرمایا۔ اس لئے اُسکے شکریہ میں میں اس مضمون کو اسی ناتمام حالت

میں چھوڑتا ہوں اور اپنے دوست کا خیر مقدم کرتا ہوں۔
یہ دوست میری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جب
آتے ہیں مجھ پر اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں کہ "تم اپنی
صحت کا خیال نہیں رکھتے"! میں جانتا ہوں کہ اسوقت
بھی یہ کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا حال سنائینگے جو بڑا حاذق
ہے یا کوئی مجرب نسخہ میرے لئے کسی سے مانگ کر لائے
ہونگے۔

"آیئے آیئے، مزاجِ عالی، بہت دن بعد تشریف
لائیے"۔

ملخص

غُربت و وطن

رشید، لکھنے کی میز پر، داہنا ہاتھ، اور ہاتھ پر سر رکھے ہُوئے خیال میں مستغرق بیٹھا ہی. لمپ کی روشنی اس کے آدھے چہرے پر پڑ رہی ہی اور بتا رہی ہی کہ گو شہر میں - اُس شہر میں جہاں رشید، غُربت کے دِن اُنس و اضطراب کی کچھ عجیب آمیزش کے کاٹ رہا ہی- گو اس شہر میں اس وقت خاموشی چھائی ہُوئی ہی، لیکن اس کے دِل میں خیالات کا طُوفان موجزن ہے .

چار طرف سناٹا ہی اور تاریکی ؛ صرف کمرے میں گھڑی کھٹ ...... کھٹ .... کھٹ کر رہی ہی ؛ گلی کا کُتا

بھنبھناتا ہے، قریب کے کمرے میں نوکر، دن کا کام ختم کرکے گہری نیند (حیات ساحیانہ کا انتام!) سو رہا ہے، اور اس کی خرخراہٹ کی آواز یہاں تک آرہی ہے۔ رشید اپنے خیالات سے عاجز آکر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور بہت مُضطرب حالت میں کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے! اور اپنے دِل سے باتیں کرنے لگتا ہے:۔

غُربت اچھّی کہ نئی دُنیا، نیا آسماں، نئے مناظر پیشِ نظر ہوتے ہیں۔

نہیں، وطن اچھّا کہ پُرانے دوست، پرانے رفیق، جانی پہچانی آوازیں، جانی پہچانی صُورتیں، سُنائی دیتی ہیں، دِکھائی دیتی ہیں۔

نہیں، غربت اچھی جس میں ہر تجربہ نیا، ہر بات نئی۔ جو دو آدمی ملتے ہیں گویا دو دریا ہیں کہ پہلے جدا جدا بہہ رہے

تھے، اب سنگم ہوا .

نہیں، وطن اچھا، جہاں پرانے دوست گویا دو پودے ہیں کہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے اُگے اور بڑھے۔

نہیں، غربت اچھی، جہاں دوست نما دشمن اور آشنا صورت اغیار تو نہیں ہوتے جنکی مدارات کرنی پڑے. جہاں غیر یہ صاف کہ کے ملتا ہے کہ میں غیر ہوں، اور دوست، آہ! دوست نہیں تو شناسا بنکے جُدا ہوتا ہے .

نہیں، وطن اچھا، جہاں وُہ آدمی نہیں ملتے، جن سے دل میں نہ حسِ محبت پیدا ہو، نہ یادِ ایام گذشتہ :

نہیں نہیں بے یار نہ غربت اچھی، نہ وطن اچھا، اور با یار ــــ یہ اُن خوش نصیبوں سے پوچھئے جو یار رکھتے ہیں"

رشید ایک آرام کُرسی میں گر پڑتا ہے؛ اور پھر خاموش، خیالات میں محو ہو جاتا ہے؛ پھر تھوڑی دیر کے

بعد کاغذ کے ٹکڑے پر پنسل سے کچھ لکھتا جاتا ہے۔ یہ ایک زائیدہ اضطراب غزل تھی، جسے وہ تسکینِ خاطر کے لئے کونے میں رکھے ہوئے ہارمونیم پر جا کر بجاتا ہے۔

غزل

بنے ہیں ہونٹ مرے نالہ و فغاں کیلیے — ہے سینہ وقف مرا سوزشِ نہاں کیلیے

کوئی زمانہ کا شاکی، کوئی فلک کا ہے — ہماری سارے گلے اپنے مہرباں کے لئے

ہلاک کر کے رہیگا مجھے تغافلِ بت — ہے اک نگاہ کا اعجاز نیم جاں کے لئے

ہو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے سب مجھ پہ مشق ہی احباب — رہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

ہوئے جو طعنۂ اعدا کبھی ذرا کو بند — زباں سے ہی کام اعزا نے خود سناں کے لئے

کرا کے چاک تو نہ اے برق اس سے کیا حاصل — شرارہ ایک تھا کافی اس آشیاں کے لئے

مرا جو حصہ ہے وہ مجھ کو اے مصیبت دے — ہوا کرے ہے اگر عیش کل جہاں کے لئے

چمن میں بلبلِ مہجور کی نہیں کچھ یاد — تڑپ رہی ہے قفس میں جو بوستاں کے لئے

بھلا دیا وطن جب میں جانوں اے غربت! وطن کا عشق ہر اک رگ میری جاں کیلئے

مقابل کے مکان کی کھڑکی کھلتی ہے، اور رشید کا پڑوسی

اس شہر کی زبان میں کہتا ہے:-

"مسٹر رشید! شاید آج آپ کے وطن سے کوئی بڑی خوشخبری آئی ہے۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا ہے، لیکن میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں؛ (اور ذرا معترضانہ تبسم سے) مگر آدھی رات کو تو خوشی نہ منانی چاہیئے"۔

~~~~~~
~~~~~~

صحبتِ ناجنس

دو لڑکیوں میں خط و کتابت

حیدرآباد دکن - ۲۴ ستمبر ۱۹۲۵ء

میری پیاری سلما جانی! جو باتیں میں کسی سے کہ نہیں سکتی وہ تمہیں لکھنا چاہتی ہوں! ہائے وہ مدرسے کے دن، کہ جب مجھے کوئی تکلیف ہوئی یا مرضی کے خلاف کوئی بات ہوئی اور میں تمہارے کمرے میں پہنچی، اگر تم کسی بات کسی کام میں مشغول بھی ہوئیں تو بے تحاشا تم سے لپٹ کے گلے میں بانہیں ڈالکر، تمہارا منہ چوم کے اپنی طرف متوجہ کرلیا اور اپنا دردِ دل تمہیں کہہ سنایا اور دل کی بھڑاس نکال لی۔ حیدرآباد!

آہ کتنی دُور ہُوں ، پھر اللہ رکھے تم میاں رکھتی ہو، بال
بچے رکھتی ہو ، گھر کے کام دھندوں میں مشغول ہو، دیکھوں
تمہیں اس خط کے پڑھنے کا وقت بھی ملتا ہے یا نہیں .
مجھے یہ خط" مَیں خیریت سے ہُوں اور تمہاری خیرو
عافیت کی خواہاں" سے شروع کرنا چاہئے تھا ، گر طبیعت
یکسو ہوتی تو کرتی ، تمہاری طرح تھوڑا ہی ہوں ، تمہاری زندگی
میں نہ کوئی شے زیادہ نہ کوئی شے کم ، جو تم چاہتی تھیں
وُہ سب موجود ہے ! مجھے دیکھو ! مجھ پہ کیا بپتا پڑی !
پوچھو تو سناؤں اور دِل نہ بھرے ، نہ پُوچھو پھر بھی سناؤں گی
مَیں نے تمہیں نہیں لکھا ، تین مہینے ہُوئے میں دُلہن
ہوگئی ! وُہ عذرا جسے تم ہمیشہ "دیوانی لڑکی" کہا کرتی تھیں
اب "عقل والی عورت" ہے ! مصیبتوں نے سنجیدگی سکھا دی
ابھی آدھ گھنٹہ ہوا ، ایک دیو گھر سے باہر گیا ہے اور

مَیں نے ایسا سانس لیا ہی، گویا بڑے ضیق سے نجات پائی؛ میرے ہولِ دِل کو تھوڑا سا آرام ہُوا تو مَیں نے یہ خط لکھنا شروع کیا، اِن تین مہینوں میں ہر روز تمہیں خط لکھنے کا ارادہ کرتی تھی، مگر پریشانیوں سے جو سُستی، اور خوف سے جو عطالت بدن میں پیدا ہو جاتی ہی اُس نے اس ارادے کو پُورا نہ ہونے دیا. صبح نہیں ہوتی، کہ شام ہو جاتی ہی؛ صبح کھانے کے وقت ہم اپنے کمرے سے نکلتے ہیں، اور اُس وقت میرا پیارا دیوپیکر، دیوجُثّہ، اپنی ٹوپی عجب لااُبالی ڈھنگ سے آدھے سر پر رکھ کر کوٹ عجب بے پروائی سے پہنکر باہر جاتا ہی، میری جان میں جان آتی ہے کہ اِتنے میں عورتیں مُلاقات کے لئے آجاتی ہیں، اُن سے سر کھپاتی ہوں، تیسرے پہر کو مَیں کپڑے بدل کے تازی ہَوا کھانے کے لئے اپنے ایک

قفس سے نکل کر، دُوسرے قفس میں بیٹھ کر (جس کی جھلملیاں بند ہوتی ہیں) باغ عامہ کا نظارہ کرتی ہُوں، شام ہوتے ہی گھر پہنچتی ہُوں؛ لیکن وُہ مجھ سے پہلے وہاں موجود ہوتا ہے؛ رات کو گھر میں سناٹا ہو جاتا ہے، اور اُس خوفناک قوی ہیکل بُت سے میری نفرت اَور بڑھ جاتی ہے.

یہ شادی! کس طرح ہُوئی، اس کی تاریخ مَیں تمہیں لکھُوں گی، کیا فائدہ. صرف اِن تین مہینوں کی زندگی کی تصویریں ایک ایک کر کے پیش کرتی ہوں؛ انہیں دیکھو، اور میری سلما! مجھ پر دل دکھاؤ.

وُہ لڑکپن کی اُمیدیں ایک لال کی ہلکی پرواز کی طرح غائب ہو گئیں، اُڑ گئیں؛ ایک چھوٹی چڑیا کی طرح اُن کا خُون ہو گیا. بیاہ کے بعد تیسرا یا چوتھا دن تھا، مَیں پیانو کے پاس بیٹھی تھی، وُہ مجھ سے ذرا دُور آرام کرسی پر ڈھیر ہو رہے

تھے ؛ مَیں یونہی بیٹھی بیٹھی پیانو کو بجا نہیں رہی تھی ، بلکہ کھیل رہی تھی کہ میرے کانوں میں وُہ بھاری اور کرخت آواز آئی

"ہم سُنے ہیں آپ بہت اچھے گا اُن گاتی ہیں ، اگر دو ایک ہم کو سُنائیںگا ، تو بڑی مہربانی ہوئنگی"۔

مَیں رُکی ، اور استعجاب آمیز سوال کی نظر سے اُنکی طرف دیکھنے لگی ؛ معلوم نہیں کہ اس نظر کے اُنھوں نے کیا معنی لئے کہ کہنے لگے :۔

"کوئی راگنی ، کوئی ٹپّہ ، کوئی غزل ہمارے واسطے ہونا ، ہم یہ نہیں کہتا کہ کیا سُناؤ ، آپ کو جو پسند ہو وُہ سُناؤ"..........

مَیں مبہوت نظر سے دیکھ رہی تھی اور اس تقریر کو سُن رہی تھی ، وُہ پھر فرمانے لگے :۔

"اچھّا اَور کچھ نہیں تو یہ غزل تو سُناؤ :۔

دونوں ہاتھوں میں مہندی لگالے پری، لگالے پری، ہاں لگالے پری"۔

میں کیا جواب دیتی، حیران تھی، وہ مسلسل گانے کے لئے چیزیں پیش کرتے جاتے تھے۔

"اچھا صاحب! غزل نہیں تو کوئی ناٹک کی چیز:۔ دیتا ہوں تجھ کو تختِ سلیمان کی قسم (اور اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر پُورے جوش اور نہایت محبت اور حرص بھری نظر سے مجھے دیکھ کر) بل مجھ سے اے پری تجھے انسان کی قسم"۔

مجھے چُپ لگی ہُوئی تھی، آخر کار وہ اُٹھ کر اور پیانو کے قریب آ کر فرمانے لگے :۔

"صاحب! کیا غضب ہے، میں اس قدر التماس کیا ہوں آپ قبول نہیں کرتے ہو، مہربانگی کر کے مداری لال یا امانت کی کوئی چیز آپ سُنا دینگے تو کیا ہوگا"!

میں نے بہت چاہا کہ ان کا خیال کسی اور طرف ہٹ جائے لیکن میں دیکھتی تھی کہ انکا اصرار بڑھتا ہی جاتا ہی، آخر میں نے مجبور ہو کر کہا :-

"مداری لال اور امانت کون ہیں ؟ میں نے تو کبھی انکا نام کبھی نہیں سُنا"!

یہ میں نے سچائی سے جواب دے دیا تھا، تم ہی بتاؤ تم نے بھی کبھی انکا نام سُنا ہے ؟ ہم نے تو نہ مدرسے میں، نہ گھر میں، نہ کسی کتاب میں یہ نام دیکھے، مگر انہوں نے اُسے بناوٹ سمجھا اور فرمانے لگے :-

"ایں ! آپ نہیں جانتے، پر میں تو جانتا ہوں، ہندوستان کیا، دکن کیا ہر جگہ انکا نام مشہور ہی"۔ اور تھوڑی سی دیر سکوت کے بعد، ایک پُرنزاکت مگر سعنی وار تبسم کے ساتھ فرمایا:-

خفا نہ ہو صاحب! جو گانے آپ کو پسند ہوں وُہی ہم کو

سُناؤ، البتہ وُہ اچھے ہونگے"۔ پیاری سلما! پیاری بہن!
تم ہی خیال کرسکتی ہو کہ مَیں کس مصیبت میں تھی؛ میرا چہرہ
کچھ شرم، کچھ غُصّہ سے تمتما اُٹھا، اور قریب تھا کہ مَیں
بیہوش ہوجاؤں؛ مگر ضبط کیا اور طبیعت کو تھاما۔
آہ! مس مَیری، آیئے اور اپنی چہیتی شاگرد کو دیکھئے
کہ پیانو کے سامنے عاجز صمٌّ بکمٌ بیٹھی ہے۔ وہ اُنگلیاں
جنہیں آپ پیانو بجاتی ہُوئی دیکھ کر تعجب کیا کرتی تھیں اور
کہا کرتی تھیں کہ خُدا نے انہیں محض موسیقی کے لئے پیدا
کیا ہے، آیئے اور اُن اُنگلیوں کی ذِلّت کو دیکھئے؛
سات برس متواتر اسی دن کا خیال کرکے، اسی دن کے
لئے تیاری کی تاہم اُن تمام کوششوں کا نتیجہ دیکھئے، مدارِی
لال اور آمانت آتے ہیں اور آپ کی تعلیمات سب بیکار
رہ جاتی ہیں! کیا یہ ہونا تھا، کیا اِس لئے میں نے اپنی

محنت اُٹھائی تھی، اگر یہ تمام تعلیم بے سود تھی، یعنی اگر میینڈلسون[1] اور وگنیر[2] مداری لال کے حضور میں سر جھکا کر بھاگ جانے والے تھے، تو یہ تعلیم ہی کیوں دی گئی تھی، میری سلما! بتاؤ؟ آخر کیا فائدہ، بتاؤ؟ میں اپنے امانت کے شیدا خاوند سے کیا کہوں، کیا عذر کروں؟ ہاں، میرا خاوند مجھ سے "دونوں ہاتھوں میں مہندی لگا لے پری"، یا "مل مجھ سے اے پری تجھے انسا کی قسم" کا طالب ہے، میں کیا جواب دوں؟ میں اُن چیزوں سے واقف نہیں"، "مجھے ہندی گانے نہیں سکھائے گئے" "میں نے سات آٹھ برس انگریزی گانے سیکھے ہیں" یہی جواب تھے جو میں دے سکتی تھی اور یہی دیئے۔

اِس پر اُنہوں نے نہایت اخلاق اور نرمی سے کہا:۔

---

[1] [2] یورپ کے مشہور موسیقی دان ہیں۔

"بہتر! انگریزی گانے ہی سنائیے، میرے کو وہ بھی پسند ہوتے ہیں"۔

میں اتنی دیر تک انکار کرنے سے شرما رہی تھی، میں نے سوچا کہ جو کچھ میں جانتی ہوں انہیں سُنانا چاہیئے اس لئے میں نے پوچھا، "کونسا گانا گاؤں"۔

"صاحب! جو آپ کی خوشی ہو گاؤ، میں کیا کہوں"۔

اسی جواب سے میرا دل بیٹھ گیا، مگر میں نے پھر ہمت کر کے کہا: میں Bulbul and the Rose سُناتی ہوں۔

یہ کہ کے میں نے پیانو کے نوٹ پر نظر گاڑ کر، بجانا شروع کیا۔

پیانو سے ایک دردانگیز فریاد (یاد ہے، یہ مس میری کے

سلے ایک انگریزی گانا،

الفاظ ہیں ، وُہ اس راگ کے بجانے کے وقت کہا کرتی تھیں کہ پیانو سے (Plaintive cry) نکلتی ہی نکلنا شروع ہوئی اور مَیں اس میں محو ہو گئی ؛ غیاث الدین (میرے خاوند نواب غیاث الدّولہ ، غیاث الملک کا یہ نام ہے ، معاف کرنا بھول گئی ، مَیں اب انٹروڈیوس[۵۲] کرتی ہوں) کچھ دیر تک پیانو کے قریب آکر کھڑے رہے پھر آنکھیں اس طرح کھول دیں ، گویا پیانو کے شور سے گھبرا رہے ہیں ، لیکن سُننے کی وضع قائم رکھی ، دو ایک منٹ سُنا بھی ، آخر اس حالت میں نہ رہا گیا ؛ بیٹھے اُٹھے ، پھر بیٹھے ، پھر اُٹھے ؛ ایک سگرٹ جلایا ، پھر آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنا شروع کیا ، مَیں نے جب یہ دیکھا تو راگ کے پہلے ٹکڑے کو تو خواہ نخواہ پُورا کیا ، اور آخری الفاظ کے لئے پردوں پر نہایت زور سے اُنگلی

[۵۲] معروف انگریزی لفظ بہ معنی تقریب ملاقات ،

مار کر ختم کیا، ختم ہوتے ہی فرمایا: ماشاء اللہ، بہت خُوب، لیکن اب سونا چاہیئے"، کیا دلشکن داد ہی، اَے بیداد! وہ یہ داد دیکر کپڑے بدلنے کے لئے چلے گئے اور وہاں سے بِلّی کی خُرخُر کی طرح یہ آواز آنے لگی: ؎

مَیں قُربان زُلفوں کے لٹکانیوالے   مرے دِل کو گلیوں میں بھٹکانیوالے

اور میری نظروں میں یہ تصویر پھر گئی: کہ مسں مَیری اور ویگنر کو مداری لال نے کیچڑ میں پھینکدیا ہی، اور خود خشکی پر کھڑا ہوا زور زور سے قہقہ لگا رہا ہے۔

سلما جانی! ذرا خیال کرنے کا مقام ہی، مَیں کہ دیوانہ وار ہوس کے ساتھ موسیقی کی عاشق ہوں، اور سات آٹھ برس سے اُسے سیکھ رہی ہوں؛ ہندوستانی راگ کتنے جانتی ہُوں؛ مولانا حالی کا:—

"اَے خاصہ خاصانِ رُسل وقت دُعا ہی"۔ اور غلام محمد جان

آسمدی کا:-

"اُہمتِ مردانہ جگر میں تری جا ہے   مت آنکھ چُرا مجھ سے اگر شیوۂ وفا ہے"
"تُو ہو مرے ہمراہ تو پروا مجھے کیا ہے   سایہ ترے شہپر کا بہ از بالِ ہما ہے"

یا شاد یا مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی اور ایک آدھ نظم، جسے مِس میری نے بدقت تمام اجازت دی تھی کہ ہم لوگ یاد کرلیں اور پیانو یا ہارمونیم پر بجائیں، کیونکہ وُہ کہا کرتی تھیں کہ ہندوستانی راگ یاد کرنے سے تمہارا انگریزی مذاق بگڑ جائیگا، وُہ ہیں کہ رات دِن ہندی راگوں میں محو ہیں، اب بنے تو کیسے بنے۔

لُطف تو جب آتا ہے: جب میں خیال میں مستغرق ہو کر اولڈ لینگ سائین[۱] (Auld Lang Syne) گانے لگتی ہوں، تو وُہ فوراً کوئی گیت شروع کر دیتے ہیں جس میں ہجر، وفا، وصل، زخم، تیر، یا سانولیا، سیّا،

[۱] ایک مشہور فرنگی گانے کے الفاظ۔

جوبن، سیان، پیان وغیرہ لفظوں کی بھرمار ہوتی ہے، نہ وہ میری کہی کو سنتے ہیں، نہ میں انکی کہی کو سمجھتی ہوں! کمرہ منارۂ بابل ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں اگر کہیں دُردانہ خانم (یہ ایک ایرانی ماما ہے، جسے والد، جد کربلا معلّٰی کی زیارت سے واپسی کے وقت اپنے ساتھ لائے تھے، اور جس نے مجھے پالا ہے) کمرے میں آگئی اور اس نے مجھ سے فارسی میں باتیں کرنی شروع کر دیں، تو غیاث کا چہرہ پُرغضب ہو جاتا ہے، آنکھیں انگارا ہو جاتی ہیں۔ ایک دن نو برس پڑے، میں لکھنے کی میز پر بیٹھی تھی، پیاس معلوم ہوئی تو میں نے دُردانہ خانم کو آواز دی، اُس نے سُنا نہیں مجھے غصہ آگیا، تو میں پوری آواز سے چلّائی۔

"چار یک ساعت است، متّصل صدا میکنم، کسے ملتفت نمے شود، پنبہ در گوش کروند مگر!"

وُہ نہ معلوم کب کے بھرے بیٹھے تھے، کہ دوسرے کمرے سے برس پڑے، کہنے لگے:-

"یا اللہ، ہمارے کو سمجھ میں نہیں آتا، اپن طہران میں ہیں کہ لنڈن میں؛ اِتنا ہم کو سمجھ میں آتا ہی کہ ہندوستان میں نہیں ہوں"۔

مَیں چُپ ہو گئی، اور سخت نادم ہُوئی، مگر میرا کیا قصور تھا، خیر مگر آئندہ سے مَیں اُن کے سامنے دُردانہ خانم سے کبھی کسی کام کو نہ کہتی تھی۔

ایک دِن خود لہر میں جو آئے تو دُردانہ خانم سے فارسی میں گفتگو فرمانے لگے، مگر فارسی کے گلے پر وُہ کُند چھُری پھیری کہ مجھ سے دیکھا نہ گیا اور مَیں اُٹھ کے دُوسرے کمرے میں چلی گئی۔

....

سلما: سلما! آمیرے حالِ زار کو دیکھ! کھانے کے
بعد متواتر زور سے ڈکار لینے والے آدمی کے ساتھ زندگی
بسر کر رہی ہوں، کل خیال جر آیا تو دن بھر روئی، پیٹ
پر ہاتھ پھیر کرنا، اور اونٹ کی طرح ڈکار لینا! اُف غضب!
غضب، یہ میں سوائے تمہارے کسی کو نہیں لکھ سکتی! اور
اگر تم نے کوئی تدبیر نہ بتائی، تو تمہاری عذرا گُھل گُھل کے
مر جائیگی ....

ایک دن نمعلوم کس طرح ادبیات کا ذکر آگیا، پوچھنے
لگے "تمہارے کو اُردو کا کونسا شاعر اچھا معلوم ہوتا ہے؟" یہ
ایسا بیڈھب سوال تھا کہ میں بہت گھبرائی، صاف یوں ہے
کہ میں نے اُردو کی ادبیات سے بہت ہی کم فائدہ اُٹھایا ہے
میں تو یہی سُنا کرتی تھی کہ اُردو کی ادبیات بہت خراب ہیں،
اخلاق بگاڑتی ہیں، مدرسے میں سوائے مولانا حالی کے

(کہ اُن کا بھی کلام نہایت مختصر اور منتخب پڑھایا جاتا تھا) اور کسی شاعر کا نام سُنا نہیں، بس مَیں نے بغیر اِس خیال کے کہ دُوسرے شاعروں سے مقابلہ کیا نہیں، یہ کہدیا:

"مولانا حالی کو"

"حالی کو پسند کرنے کی وجہ؟"

!!

؟؟

!!

سمجھیں؟ یعنی وُہ ہمہ تن سوال تھے، اور مَیں ہمہ تن اِستعجاب؛ اور اس طرح ایک دُوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

میرے پاس کیا جواب تھا، کہ مَیں دیتی۔

آخر کہنے لگے: "مَیں حالی کو تو کچھ بھی نہیں پسند کرتا! ہم قافیہ نثر لکھتے ہیں، میرے کو "پیامِ یار" میں غزلیں لکھنے

والے سب پسند ہیں ، اور داغ کے کلام کا تو کیا کہنا ، واہ واہ سب سے اچھا ہے ، کیا ہجر ، کیا وصل کی تصویریں ہیں، کیا معاملہ ہے ، کیا چوچلا ! آغا شاعر بھی بہت اچھا ہے"۔
پھر کہنے لگے : "یہ کیا بات ہے تم مدرسے میں پڑھی ہو ! لیکن داغ کو نہیں جانتیں" ۔
اس پر مجھے بھی غصہ آگیا ، اور میں نے جواب دیا : "بیشک ! لیکن آپ بھی تو شیکسپیر اور ملٹن سے واقف نہیں"۔
اُنھوں نے تڑپ کے جواب دیا : "میں انگریز ہوتا تو بیشک واقف ہوتا" ۔ بس اس پر ہم دونوں چپ ہو گئے ، میرے ہونٹوں کو داغ نے سی دیا ، اُنکے ہونٹوں پر ملٹن نے مُہرِ سکوت لگا دی ۔
غرض یُوں بسر ہوتی ہے ، مَیں تو سمجھتی ہُوں کہ کسی غیر مُلک کے باشندے کے ساتھ میری شادی ہُوئی ہے ؛

وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں ہندوستانی بی بی نہیں ملی ۔

....

ابا جان کی بے پروائی سے تم واقف نہیں! عجب بے پروا آدمی ہیں ۔ اماں جانی نمایش پرست، دولت پرست ہیں ، میں یہاں کیوں بیاہی گئی ؟ اِس سوال کے جواب کی غالباً اب ضرورت نہ رہی ہوگی ۔

اِس شادی پر جب کبھی غور کرتی ہوں تو مجھے یقین ہوجاتا ہے کہ میں کنوئیں میں دھکیل دی گئی ، اور ماں نے مجھے کنوئیں میں دھکیلا ؛ پہلے یہ ارادہ کرلیا کہ مجھے کنوئیں میں دھکیلینگی ، اور پھر پہلا موقعہ جو انہیں ہاتھ آیا اُسے نہ جانے دیا ، اور میری پیٹھ پر ایسے زور سے دھکّا مارا کہ میں سر کے بل اندر گر پڑی ؛ زندگی کچھ نہیں ؟ ہاں بیشک ، مگر زندگی سب کچھ ہی ؟ اِس کے لئے بھی ہاں بیشک ، بات یہ ہی کہ

مَیں اب عقل ہی نہیں رکھتی کہ کسی چیز میں ٹھیک محاکمہ کرسکوں
کیا عجب بات ہی، میری سلما! کیا عجیب بات ہی کہ جس شخص
کی قابلیت، حالتِ تربیت ایسی ہو کہ یہ کہا جاسکے کہ دُنیا
میں ضرور خوش قسمت اور خوشحال رہیگا، وُہی بدبخت، ناکام
ناشاد رہتا ہے؛ اور آخر عمر میں اس نتیجہ کو پہنچتا ہی کہ دُنیا
میں خوبی، اُمّید و سعادت نہیں ہی۔ برخلاف اس کے،
وُہ جو ہر طرح سے ناقص ہے، ناکارہ ہی، بے علم ہے،
وُہ خوش قسمت رہتا ہی؛ اپنی زندگی میں کامران، شادمان
اور ہر طرح کی خوبی اِس کے لئے دَوڑی ہوئی آتی ہے:
مثلاً میں خدا کے فضل سے اچھے گھر میں پیدا ہوئی، اچھی
طرح پلی، تعلیم پائی؛ بیاہی گئی تو سب کہتے تھے کہ کیا
قسمت ہی، واہ! ایسا بڑا گھرانا، ایسی بڑی ثروت،
ایسی بڑی دولت، یہ لڑکی بہت خوش رہیگی"، لیکن میں ایسی

حسرت ہیں مر رہی ہوں کہ کاش غیاث نے میری طرح اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کی ہوتی، لیکن وہ ہیں کہ شام کو نوکروں پر گالیوں کی بوچھاڑ، ناٹک کے گانوں کے عاشق زار، گھوڑ دوڑ کے، اور اس میں جوا کھیلنے کے دلدادہ؛ یہ حالت دیکھ کر تمام اُمیدوں کا خون ہو جاتا ہے۔

میں خوش قسمت ہوں یا بد قسمت؟ تمہیں ان تین مہینے کے واقعات جو میں نے تمہیں لکھے ہیں پڑھ کر مجھے بتاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ میں کیا کروں، کس راستے پر چلوں، اُسے اپنے راستے پر لاؤں یا اس دیو پر اپنی جان ضائع کر دوں؟

بعض لحاظ سے دیکھا جائے تو میرا خاوند بُرا نہیں؛ نہایت امیر ہے، اور چونکہ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے، اِس لئے کُل دولت کا خود ہی مالک ہے، حیدرآباد کے مدرسے میں کچھ دن گذارے ہیں، اِس لئے پڑھ لکھ بھی سکتا

ہے ، اس کی شکل کی کیفیت شاید میں اُوپر لکھ چکی ہُوں ،
ویسے بھی تم نے اس خط سے اس کی تصویر ذہن میں کھینچ
لی ہوگی ، سراپا صحت ہی ، اس قدر قوی کہ پہلوان معلوم ہوتا
ہے ، آواز بھاری گویا ہاتھی پانی پی رہا ہی ، بال موٹے
موٹے ، بڑی بڑی مُوچھیں ، چوڑی چوڑی بھویں ، باہر
کو نکلی ہُوئی بڑی بڑی آنکھیں سیاہ اور چمکیلی اور خوفناک،
اِس کے جسم وطبیعت کی تمام ہیئتِ مادی ان آنکھوں میں
آکر جمع ہوگئی ہے ، دِن کو جب وُہ باہر چلا جاتا ہی ، تو
بھی مَیں ڈر ڈر کے نفرت کر کر کے ان آنکھوں کا خیال
کیا کرتی ہُوں ، جو مجھے گھُورتی ہوئی نظر آتی ہیں ، کیونکہ
غیاث مجھے بے اِنتہا بیتابی کے ساتھ چاہتا ہی ، اور
اِس محبت سے مجھے اور وحشت ہوتی ہے ، تم جانتی ہو
کہ مجھے اِنسان کے کُل اعضا میں آنکھیں بہت پسند ہیں ؛

خُدا نے اچھّی آنکھیں کچھ عجب شئے بنائی ہیں، لیکن اسکی
ذ ... کہ آنکھیں ہی مجھے نفرت اور خوف دِلا رہی ہیں
یہ آنکھیں، یہ ڈکار، یہ آواز، یہ دونوں ہاتھوں میں
مہندی لگا لے پری" کا عشق کچھ نہیں سُوجھتا کہ کہاں بیاہی ہوں
اب انکی طبیعت کا حال سُنیئے، نچلا خاموش کبھی بیٹھا
ہی نہیں جاتا، ہر بات میں دخل در معقولات کا بے انتہا شوق
ہے، سیاہ ابر کی طرح گھر پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہی، بے انتہا
باتونی، مگر شاید میں دسویں حصّے کو بھی کان دھر کر نہیں
سُنتی، کیا عمر بھر یُونہی زندگی گذریگی؟ میں اس
بوجھ کو یُونہی اُٹھاؤنگی، میں ایسے خاوند کی تو تمنّا نہ
رکھتی تھی، ایسا خاوند نہ چاہتی تھی، مگر انسان جو نہیں
چاہتا وُہی اُسے مِلتا ہے۔

ممکن ہی کہ میرا جسم اُسکے جسم سے نفرت نہ کرے

مگر میں تمہیں یقین دلاتی ہوں، کہ میری رُوح، میری طبیعت اُسکی رُوح، اُسکی طبیعت سے ہمیشہ ہمیشہ اور پُوری پُوری نفرت کرے گی۔ باقی تم سے ملنے اور تمہیں ہزار بار چُومنے اور زبانی دردِ دل سُنانے کی تمنّا۔

تمہاری
عذرا

جواب

راولپنڈی - ۳ - اکتوبر ۱۹۲۵ء

میری شریر عذرا! تم نے اپنے خط میں عقل والی عورت بننے کی کوشش تو بہت کی، لیکن ہر سطر سے صاف ٹپک رہا ہے: کہ تم وہی شریر عذرا ہو۔
سب سے اوّل شادی کی دِلی مُبارکباد دیتی ہوں،

یقین مانو، میں اپنی عمر کے چند برس اِس بات پر فدا کرنے کو تیار ہوں، کہ تمہارے سُرخ رخساروں کو جن پر تمہارے سیاہ بال آپڑے ہوں، دیکھوں! اُن رُخساروں کو نہیں جو مدرسے میں تھے، بلکہ اُن رُخساروں کو جنہیں ہوائے تاہل نے اور دمکا دیا ہوگا! آہ! پیاری عذرا تمہیں چُومنے، دیوانہ وار چُومنے کی اور تم سے چُومے جانے کی تمنّا رکھتی ہوں، تو میں نے کاغذ پر اس جگہ ( ) کو چُوما ہی، اور میں خیال کرتی ہوں کہ میری رُوحِ محبّت کا ایک ٹکڑا، اِس جگہ چپک کے رہ گیا ہوگا، اس مقام کو تم بھی چُومنا، تاکہ اسی طرح سے میرے ہونٹ تمہارے ہونٹوں سے ایک جگہ ملیں، اور میری رُوح کو مُسرّت پہنچے۔

تم نے اپنے خط میں کیا کیا لکھ ڈالا ہی، تمہارے

خیالات نے (معاف کرنا بعض ان میں سے پراگندہ ہیں) تو
مجھے حیرت میں ڈالدیا، تم نے خذف اور الماس کو خوب
ملایا ہے۔

تمہارا خط پڑھتے وقت میں کس قدر ہنسی ہوں، میری
شوخ، شاطر عذرا! اُسی پھڑک، اُسی بھڑک، اُسی چنچل پن
سے میری آنکھوں میں پھر گئی؛ وُہی عذرا جو اپنی شرارتوں،
اور ہٹوں سے کبھی مجھے غصہ دلا دیا کرتی تھی، اور کبھی
بے تحاشا ہنسا دیا کرتی تھی۔

لیکن یہ نہ سمجھنا کہ مَیں صرف ہنسی ہی ہنسی، یا مَیں تمہارے
خط کو لااُبالی تحریر سمجھی؛ نہیں مجھے اِس خط سے یہ بھی
معلوم ہوا کہ تم نے حقیقت میں اپنا دردِ دل لکھا ہے،
اور اِس لئے مَیں نے تمہاری تحریر پر جدًا نظر ڈالی اور
کئی دِن تک اِسی کے متعلق سوچتی رہی، تمہاری اور اپنی

حالت کا موازنہ کرتی رہی ، میری اور تمہاری تربیت میں
بہت ہی کم فرق ہے ، ہم دونوں نے ایک ہی مدرسہ میں
تعلیم پائی ، لیکن ہاں چونکہ میرے والد خود شاعر اور اُردو
کے بڑے حامی اور دلدادہ تھے ۔ اس لئے کچھ ان کی
کوشش سے ، کچھ اپنے شوق سے ، مجھے اُردو میں تم
سے زیادہ مصروفیت رہی اور یہی وجہ ہے کہ میں انگریزی
تو تمہارے برابر نہیں جانتی ، مگر اُردو ضرور تم سے زیادہ
جانتی ہوں ، بولنے میں نہیں ، کیونکہ تمہاری رواں
اور پیاری زبان اور وہ بھی دِلّی کی کہاں سے لاؤں ،
ہاں لکھنے میں ، کیونکہ والد کے مضامین ، اور اُن کے
کتبخانے کی کتابیں اکثر پڑھتی رہی ہوں ، اِس لئے
طبیعت تحریر کی اُردو سے آشنا ہو گئی ، پیانو ، موسیقی ،
نقاشی ، اِس میں ہم دونوں برابر ہیں ، پھر بیاہ کا زمانہ آیا ،

قسمت نے بیاہ کے قرعہ میں میرے نام کے ساتھ، ولایت کے پاس شدہ انجنیر، مسٹر حامد کا نام نکالدیا، تمہارے نام کے ساتھ نواب غیاث الدین کی چٹھی نکلی، اور ہمارے ماں باپوں نے ہمیں اپنی آغوش سے جدا کر کے ان لوگوں کے پہلو میں پھینکدیا۔

دل چاہتا ہے کہ اس مسئلہ ازدواج پر کچھ تھوڑا سا وعظ کہوں پہلے بیاہ شادیوں میں کیا دیکھا جاتا تھا، یہی نا کہ بر، ہم کف ہے یا نہیں، ایک برادری کا ہے یا نہیں، اس کف اور برادری پر سب چیزیں قربان کردیجاتی تھیں، پھر اصلاح ہوئی کف کا خیال ترک کردیا گیا، تعلیم کا زور ہوا، "بر، تعلیم یافتہ ہونا چاہئے، تعلیم یافتہ ہونا چاہئے" کا شور بلند ہوا، تھوڑے دنوں کے بعد اخلاق کی بھی چھان بین ہونے لگی، بس یہاں پہنچ کے صلاح رخصت ہوگئی، گویا اب

کوئی کام باقی نہیں رہا، لیکن مجھ سے پُوچھو تو کوئی کام ہوا ہی نہیں! اصلی اِصلاح تو جب ہی، جب لڑکے لڑکی کے مزاج، اور طبیعت کی مُناسبت کی پُوری پُوری چھان بین کیجاتے، خاوند اور بی بی دوہرے کپڑے کی ابری، استر ہیں، ابری، استر کے رنگ کی مناسبت کا کتنا خیال کیا جاتا ہے، یہ نہیں کہ دونوں ایک ہی رنگ کے ہوتے ہوں، نہیں، یکرنگی میں کوئی زینت نہیں، خیال یہ کیا جاتا ہے کہ ایک رنگ دُوسرے سے جوڑ کھاتا ہو۔

بس اِسی طرح، لڑکے لڑکی کے مزاج کا خیال لازمی ہے، اِمتزاج کے اسباب موجود ہیں یا نہیں، طبیعتوں میں ایسا تین تضاد تو نہیں کہ میل کھانا مشکل ہو، میرے نزدیک تو سب سے زیادہ اہم یہ سوال ہیں، حُسن وجمال، مال دولت، تعلیم وتربیت سب کو میں دُوسرے درجہ پر رکھتی ہوں۔

شاید تمہاری طبیعت اس وعظ سے گھبراتی ہوگی، میں
معافی چاہتی ہوں، میں اس بحث کو ترک کئے دیتی ہوں،
مگر کیسے ترک کروں، آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تم
جسے میں ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ مزاج میں سنجیدگی نہیں، الّھڑ
ہے، اور میں جسے تم ہمیشہ خیال پرست
sentimental شاعر مزاج کہا کرتی تھیں،
ہم دونوں ایسے خاوندوں کے پالے پڑیں، کہ اِن لوگوں
کے ساتھ شادی نہ ہوئی ہوتی، تو چاہے یہ بھائی ہی
ہوتے، ہم ان کے پاس دس منٹ بیٹھنے سے گھبراتے
اور شاید وہ لوگ ہمارے لئے ایسا ہی خیال رکھتے ہونگے
یہ عدالت ہے! یہ انصاف ہے؟ کہو "ہاں" سوائے اس کے
اور کچھ کہنا منع ہے، لیکن اس تضاد کا سبب کون ہے، ان
خرابیوں کا جواب دِہ کسکو قرار دینا چاہئے، میں تو بلا پس و

پیش کرتی ہوں، ہمارے ماں باپوں کو۔

اگرچہ خط لمبا کرکے تمہیں پریشان کرونگی لیکن میں بھی تمہیں اپنی زندگی کا مرقع دکھاتی ہوں؛ مسٹر حامد کیسے آدمی ہیں؟ اِن کے حسیات، اور خیالات کیا ہیں، افکار کیا ہیں؟ ان کے حسّیات اور خیالات یہ ہیں: (۰ × ۰ = ۰)

آہ! تم ایسا خاوند چاہتی تھیں، جو رات دِن تمہارے ساتھ ہنسا کرے، تمہارے کھیلوں میں شریک ہوا کرے۔ مجھے ایسے شوہر کی تمنا تھی، جو کسی باز کے پنجہ میں پھنسی ہوئی چڑیا یا کسی پژمردہ گل کو دیکھ کر میرے ساتھ روئے، میرے ساتھ ہر دم عالم خیال میں رہے۔

حال یہ ہے کہ مسٹر حامد، جب رات کو گھر میں تشریف لاتے ہیں، تو اس خوف سے کہ کہیں انکی نیند نہ اُڑ جائے، میری باتوں کا جواب بھی نہیں دیتے، اگر کسی دن تعطیل کے

ایام میں) گھر میں کچھ ٹھہرے بھی، اور میں نے اُنکی خاطر کچھ بجانا شروع کیا، تو وُہ فوراً آرام کُرسی پر بیٹھکر سونا شروع کر دیتے ہیں، میں اُن کے اوقات کا نقشہ تمہیں لکھتی ہوں:-

سونا............... ۹ گھنٹے
سرکاری کام............... ۷ گھنٹے
سیر و تفریح و ریاضت...... ۶ گھنٹے
گھر میں............... ۲ گھنٹے

میزان ۲۴

ذرا دیکھنا؟ ۲۴ گھنٹوں میں دو گھنٹے مجھے دیتے ہیں، کہ اس حساب سے سال میں میری اُنکی ملاقات صرف ایک مہینے ہوتی ہی، لیکن یاد رہے کہ ان دو گھنٹوں میں گھر کے معاملات، بچّوں کا دیکھنا بھی شامل ہی، غرضکہ

مسٹر انجنئر نے یہ حساب پورا پورا بنا رکھا ہی، اور اس پر بہت باقاعدہ عمل ہوتا ہے۔

عذرا! تمہیں بھی قسم ہی، اس تقسیم اوقات کے متعلق ذرا اپنی رائے دینا۔

گھر کے تمام انتظامات اور معاملات میرے متعلق ہیں، خانہ داری کے متعلق وہ کسی چیز میں پھنسنا نہیں چاہتے، مَیں جو چاہوں کروں، مجھے پوری آزادی ہی، بچوں کو پالوں، یا مار ڈالوں، گھر تبدیل کردوں، اسباب بیچ ڈالوں، اور خرید لوں، نوکروں کو مقرر کروں، برخاست کروں، غرضکہ جو چاہوں کروں، مختار ہوں، وہ گھر کو ہوٹل سمجھتے ہیں، اور کھانے پینے اور سونے کے لئے یہاں آتے ہیں، اِن تین باتوں کے انتظام میں وہ خلل نہیں چاہتے، اگر مَیں بیمار بھی پڑ جاؤں، تو

اُن کے مقررہ اوقات میں فرق نہیں پڑتا ، خود طبیعت ناساز
ہو تو ظاہر ہے کہ اِس دستور العمل میں تبدیلی ہو جاتی ہے:
کم سخنی کا وُہ عالم ہے کہ بات اُنکے دہانِ موزوں سے
اوّل تو کم نکلتی ہے اور جب نکلتی ہے تو تُل تُل کے، تی تی
نکلتی ہے . میری تعلیم و تربیت معمولی تعلیم و تربیت نہ تھی
مدرسے کے علاوہ گھر پر بھی مجھ پر تربیت کی بوچھاڑ رہی؛
گورنس اور کیا ، اور کیا ، سب سے گھری رہی ، پھر دُلہن
بنی ، اور ایسے شخص کو سونپی گئی ، جو بڑا تعلیم یافتہ ، سات
سمندر پار سے پڑھ کے آیا تھا ، اور اللہ ! کن کن اُمیدوں
کے ساتھ ، مَیں اپنے خاوند کے پاس گئی ، پہنچی تو عالم کچھ
اَور ہی پایا ! کیا عالمِ اُمید اور عالمِ حقیقت ، عالمِ خیالی اور
عالمِ اصلی میں ہمیشہ اتنا فرق ہوتا ہے؟
حامد نے ، تمہارے خاوند کی طرح ہر دم میرے ساتھ

رہنے سے مجھے پریشان نہیں کیا، بلکہ وہ آزادی دی جس سے میرے حق میں بے پروائی کی بو نکلتی تھی۔

تم جانتی ہو میں ایسی بدشکل تو نہیں، میری ملاقاتیں اور آئینہ اُس کی شہادت دیتے ہیں، جب یہ بات ہی تو کیوں میں اپنی تعلیم و تربیت و حُسن کے شایان، باکمالِ عفت زندگی بسر نہ کروں، کیوں میری قسمت میں یہ بے پروائی لکھی ہوئی ہی؟ اسے سوچتے سوچتے میں کبھی چلّا اُٹھتی، اگر یہی بے پروائی ہی تو میں بھی، ناولوں کی سی زندگی شروع کیوں نہ کروں"، یہ شخص جو میری تحقیر کرتا ہی، اُس کا جواب تحقیر سے دُوں" میری معنویات، اور میری مادّیات میرا بازو پکڑتے تھے، اور ایک اپنی طرف کھینچتی، اور دُوسری اپنی طرف، آدھی رات تک اپنے خاوند کا اِنتظار کرتے ہوئے اپنی لڑکی کو تھپکاتی ہوئی، اِس کشمکش میں رہا کرتی تھی، میں

سوچتی تھی، کہ میں اپنے خاوند کی اسیر، اُس کی باندی ہو سکتی ہوں، مگر اُس کی طرف سے باندی کرنے کی کوشش تو دیکھو وُہ کیا، فداکاری، محبت، مگر اس کا وہاں نام و نشان نہیں تھا، شاید مَیں نے پڑھا لکھا نہ ہوتا تو یہ خیالات میرے ذہن میں نہ آتے، شاید میری نظر سطحی ہوتی، اور اِس لئے مَیں زیادہ متحمل، زیادہ صابر ہوتی، شاید میرے ذہن میں نہ آتا کہ حقارت کا مقابلہ حقارت سے کیا جا سکتا ہے، شاید مَیں یہی نہ سمجھتی کہ میری حقارت کی جا رہی ہے (مگر نہیں تعلیم نہ پاتی تو اَور بھی زیادہ وحشی ہوتی، سوچنے، موازنہ کرنے، اور طبیعت کو روکنے کا مادہ نہ ہوتا)۔

ایک دِن ایک عورت اپنا دُکھڑا سُنا رہی تھی، مَیں نے ہمدردی کے طریقے سے کہا، صبر کرو، صبر، اچھی چیز ہے، وُہ شکایت آمیز آواز سے کہنے لگی "بیشک، صبر، مگر صبر

کے بعد قبرؔ، سوچتی ہُوں تو اُسے صحیح پاتی ہوں! اِنسان دو مرتبہ دُنیا میں نہیں آتا، شباب عَود نہیں کرتا، فرض کرو کہ یہ بے اعتنائی میری طرف سے ہوتی تو کیا آہیں شکایت کا موقعہ نہ ہوتا۔

یہ باتیں تمہیں لکھ رہی تھی، کہ میری چھوٹی لڑکی جمیلہ۔ دوڑی دَوڑی میرے پاس آئی اور اپنی پیاری پیاری، ننھی ننھی آواز سے کہنے لگی: امّاں جان! آج تم نے مجھے چوما نہیں" اور یہ کہ کے کُرسی پر چڑھ کر میری گود میں آبیٹھی، اور اس نے تمام میری دِل کی جراحتوں پر مرہم کا کام دیا۔ عذرا! پیاری، خُدا تمہیں بھی بال بچّہ دے، اولاد بڑی نعمت ہے، ساری دُنیا کے غم اُس کے سامنے بھاگ جاتے ہیں، اپنی بچیوں کو دیکھ کر یہ زِندان مجھے بہشت معلوم ہوتا ہے، یا میں اپنے تئیں ایک باغ تصوّر کرتی ہُوں، جس میں یہ پھُول کھِل

رہے ہیں ، جُوں جُوں پُھول کھلتے ہیں ، باغ کی مسرت بڑھتی جاتی ہے ۔

پیاری عذرا ، مَیں دیکھتی ہوں کہ علم میں میرا خاوند چاہے مجھ سے بڑھ کر ہو چاہے میرے برابر ہو ، ایک بات میں تو مَیں قطعی طور پر اُس سے بڑھی ہُوئی ہوں ، اور وُہ بات محبت اور شفقت ہی ، مَیں اپنی بچیوں کو چُومتے وقت اپنی محرومیت ، اور اپنی بدنصیبی سب بھُول جاتی ہوں ، حامد میں شفقت ، اور محبت کا نشان تک نہیں ، اُس نے نہ اُقلیدس میں اُسے پڑھا ، نہ جبر مقابلہ میں اس لفظ کو دیکھا آج مَیں ان لڑکیوں کو لیکر چلی جاؤں ، تو اگر میری ضرورت اُسے نہ ہو تو کبھی بھُول کر بھی لڑکیوں کا خیال نہ کرے ، مَیں نے ابھی کہا تھا کہ یہ حِسّ شفقت میرے لئے اپنے خاوند پر تفوق کا باعث ہی ، لیکن غور سے دیکھو ، تو یہی تفوق میری

اور کل عورتوں کی ذلت کا باعث ہوتا ہے۔

حامد کو گھر میں اگر کسی چیز سے دلچسپی ہے تو اس سے کہ لڑکیوں کو نقشہ کشی سکھائے، کسی دن تعطیل کا پورا دن اس میں صرف ہو جاتا ہے، بڑی لڑکی سعیدہ ابھی سال بھر ہوا علیگڈھ مدرسہ نسواں میں بھیجدی گئی، وہاں لوگوں نے اسکی نقشہ کشی اور مصوری کی لیاقت دیکھکر بہت تعجب کیا، کبھی دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیجاکر (انہیں بائیسکل پر چڑھنا سکھاتے ہیں)

میں دعا کرتی ہوں ان دو لڑکیوں کی قسمت میری سی نہ ہو، یہ تصویر کھینچنے والی، بائیسکل پر سوار ہونے والی لڑکیاں ساکن ورا کدا اور ٹھوس طبیعت والے خاوندوں کے پالے نہ پڑیں!

بارہ برس سے میں حامد کی بی بی ہوں، مجھے تو یاد نہیں پڑتا، مکانوں کے نقشے یا کھیلنے کے تاش کے علاوہ کوئی کاغذ میں نے اُنکے ہاتھ میں دیکھا ہو، نقشے کھینچنا،

ایک، تاش کھیلنا، دو، یہ اُن کے شغل ہیں، کبھی کوئی بحث کبھی کوئی بات، جس سے دِل میں حرکت، دماغ میں چمک پیدا ہو، میں نے اُن سے نہیں سُنی، اُن سے ملنے دوست بھی آتے ہیں، تو چُپکے چُپکے تاش کھیل کے چلے جاتے ہیں، دُنیا میں اُنہیں کسی چیز کے متعلق جوش نہیں آتا، ان دو مشغلوں کے علاوہ دُنیا کے کسی واقعہ کا اُن کے دماغ میں گذر نہیں ہوتا، اِن کھیلوں، ان شغلوں کو بھی مقررہ اوقات میں کرتے ہیں، غرضکہ اُن کا فلسفۂ حیات دُنیا میں نباتات کی طرح خاموش زندگی بسر کرنا ہے، ہاں یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ زندہ ہیں، کبھی کبھی تاش کھیل لینا ہے۔

وُہ دِن نہ بھُولُونگی، کئی برس ہُوئے، اس سکوتِ مطلق سے عاجز آکر میں ایک دن اُن سے خُوب لڑی، اِس طرح:-

"اِس ٹھیرے پانی جیسی زندگی سے تو مَیں اُکتا گئی، خُدا کے لئے کچھ حرکت کرو، کوئی بات کہو، اور نہ سہی مجھ سے لڑو، شور مچاؤ، مجھے معلوم تو ہو کہ تمہاری رگوں میں خون دَوڑتا ہی، اور مَیں ایک مرد کی رفیقہ ہوں، جاؤ کسی بیگانی عورت سے محبّت کرو، تاکہ اس حالت کو دیکھوں، اور اِسی طرح اِس یکرنگ، یک آہنگ زندگی میں کچھ فرق آئے، ورنہ یہ مکان قبرستان سے بدتر ہو رہا ہی، یہ مَوت جیسی زندگی کب تک رہیگی، اچّھا، یہ نہیں تو آؤ، مجھے مارو، میرے بال نوچو، آؤ، کچھ تو کرو، مَیں کیا کیا باتیں تمہیں سُنا رہی ہوں، سُنتے ہو، سمجھتے ہو کہ نہیں"......

مَیں اِس چیخنے چِلّانے سے تھک کر چُپ ہو رہی، مگر اُنکی طرف سے کوئی جواب نہ تھا، نہ استہزا، نہ غُصّہ،

نہ حدّت، کہا تو یہ کہا (وُہ بھی نہایت آہستہ سے) ”ذرا میرا کوٹ لادیجئے، جمیل کے ہاں جانا ہی، اُن سے آج تاش کھیلنے کا وعدہ کیا تھا“ یہ کہہ کے باہر چلے گئے مَیں کرسی پر گر پڑی اور بڑی دیر تک رویا کی۔

ساتھ ہی اس کے یہ خیال رہے، وُہ میری کسی طرح کھُلی کھُلی تحقیر، تذلیل کبھی نہیں کرتے، کبھی ”تم“ کا لفظ مَیں نے اُن کی زبان سے نہیں سُنا، ہمیشہ ”آپ“ کا استعمال کرتے ہیں، نہایت عزّت اور احترام کا برتاوٴ کرتے ہیں۔

لیکن یہ احترام کچھ مخصوص احترام نہیں، طبیعت کی اُفتاد اسی طرح ہُوئی ہی، گویا ایک کل کا آدمی ہی، جیسے اِسی طرح کی کوک ملی ہی، اور اِس کوک کے مطابق چل رہا ہی باہر والے ہمیں سمجھینگے کہ ہماری زندگی بڑی اچھّی، اور

قابلِ رشک زندگی ہے، لیکن اگر اس پوشیدہ حقیقت کو دیکھیں تو.....

پیاری عذرا! تم نے اپنے خاوند کے حالات میں لکھا ہے!

"خاموش نہیں بیٹھا جاتا، ہر بات میں دخل دیتا ہے، حرص بھری نظروں سے مجھے دیکھتا ہے وغیرہ وغیرہ" میں اس کے جواب میں تمہیں مبارکباد دیتی ہوں، اُس کی لالچی نظریں، غرورِ نسوانی کے لئے غذا ہیں، میں تم سے کہتی ہوں ہنسی خوشی زندگی بسر کرو، تمہاری، اور تمہارے خاوند کی تربیت میں اختلاف ہے، مزاج میں بھی تھوڑا سا اختلاف ہے، مگر نہ اتنا کوشش کر کے ایک دوسرے کے موافق نہ ہو جائے پس اس کے ساتھ ہنسی خوشی بسر کرو، تمہارے خاوند کی ایک زندگی تو ہے، کچھ پرواہ نہیں، اگر وہ شور مچاتا ہے، ڈکار لیتا ہے، ناٹک کے گانے گاتا ہے، یہ باتیں اس قدر تحمل فرسا نہیں، جیسی میری گھر کی ہیجر کت،

بے مآل زندگی، مَیں ان اِحترامات کی کیسی برداشت کروں، تمہیں یاد ہوگا، شادی سے پہلے مَیں کہا کرتی تھی کہ مَیں اپنے خاوند پر حکم کیا کرونگی، اُس کی آمر مُجبر ہونگی، لیکن اب دیکھو میرے تمام خیالات بدل گئے، مَیں چاہتی ہوں، کہ وُہ میرا اِحترام کرے نہ کرے، لیکن مجھ سے اپنا احترام کرائے، اور دِل میں ایسا گھر کرلے، کہ چاہے مجھے اذیتیں دے لیکن مَیں اُس کی مطلوب مُشتاق رہوں، ان اذیتوں سے لذّت اُٹھاؤں۔

اُف اِنسان، بے صدا جینا کچھ جینا نہیں، اُردو کا شیکسپیر، غالبؔ، کیا صحیح کہ گیا ہے: ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

سکون کی خواہش ہے تو اس کیلئے قبر موجود ہے، مرنے سے

کوئی روکتا نہیں ؛ یہ سمجھ لو، کہ فکر کی لذّت ، خیال کی لذّت، شور وشغب کی لذّت سے بڑھ کر ہی ، مگر نہ حِس نہ حرکت ، نہ عالمِ خیال ہیں میرے ساتھ شرکت ، نہ عالمِ وجود میں میرے ساتھ شرکت ! اس کو زندگی کہتی ہو؟

باقی تمہاری پیاری آنکھوں ، تمہارے سیاہ بالوں ، تمہارے سُرخ ، گلگوں رخساروں سے ، اشتیاق اور حسرت کے ساتھ لاکھوں کروڑوں بوسے لینے کی آرزو .

تمہاری مفتون

سلمیٰ



حضرت دل کی سوانح عمری



سے خواہش کی گئی ہے کہ میں
اپنی سوانح عمری لکھوں، اس میں
شک نہیں کہ میرے حالات فائدے
سے خالی نہ ہونگے، لیکن مشکل یہ ہے کہ میرے سوانح، میری
کیفیات، میری زندگی کی صعوبات لوگوں کو یا تو یقین
نہ آئینگی یا سمجھ میں نہ آئینگی. مثلاً ایک چھوٹی سی بات لیجئے
میں اثر پذیر بہت ہوں، خدا نے بیشمار مخلوق پیدا کی ہے،
اور اس بیشمار مخلوق میں میں ایک ناچیز مختصر چھوٹی سی شئے
ہوں، لیکن میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں (اور یہ حکایت

امرِ واقعی ہی، کچھ فخر نہیں) کہ اس تمام مخلوق میں کوئی مخلوق نہیں جو میری برابر متاثّر ہوتی ہو. اسے کون یقین کریگا؟

پھر مَیں ہر چھوٹی بڑی شَے سے متاثّر ہوتا ہوں، نئی، پُرانی، قدرتی، مصنوعی، ظاہری، باطنی، صُوری، معنوی، جاندار، بیجان، غرضیکہ کوئی چیز ہو مجھ پر اثر کرنے کے لئے کافی ہے. لیکن آپ سے سچ کہوں ـــ اور سچ ہی کہونگا یا تو سوانح عمری لکھوں گا نہیں، یا لکھوں گا تو سچائی سے منحرف نہ ہونگا، کوئی چیز مجھ پر اتنا اثر نہیں کرتی جتنا.... مَیں کیسے کہوں آپ شُبہ کرینگے.... جتنا.... جتنا.... نا.......حُسن.

میری بساط مُٹھی بھر کی بھی تو نہیں، لیکن حسین چیز دیکھی اور بیتاب ہو گیا. بانسوں اُچھلنے لگتا ہوں، دھڑکنے لگتا ہوں، مَیں کسی سینے میں ہُوں، اور وُہ سینہ کسی لیلیٰ

میں ہو، عبائے تقویٰ و زہد میں جامۂ رندی وخراباتی میں، عالم وادیب کے چوغے میں، یا سپاہی اور محارب کی وردی میں، کسان کے کُرتے میں، یا رئیس کے زر دوز لبادے میں، غرض مَیں کہیں چھپا ہوں، وُہ چیز جسے حُسن کہتے ہیں، میرے سامنے ہُوئی اور مَیں ازخود رفتہ ہو گیا۔

ایک اَور بات ہے جس سے مَیں اپنے حالات لکھتے ہُوئے ہچکچاتا ہوں، مَیں نے اِس دُنیا میں آرام نہ دیکھا، تکلیف اور درد میری قسمت میں تھا، گھُلنا، ٹکڑے ہو جانا میرے نصیب میں تھا، اِس وسیع دنیا میں، ہر شئے عیش میں ہے اور نہیں ہوں تو مَیں۔ وجہ اِس کی کیا ہے؟ یہی کہ اَور جتنی چیزیں ہیں وُہ اُس چیز سے (اُسے نعمت کہوں یا مصیبت؟) بری ہیں، جس سے میرے رگ وریشہ کی

ساختہ ہی، یعنی میں منتخص ہوں، وہ نہیں ہے۔

۲- سب سے پہلی حسین چیز جو مجھے یاد ہے، اور جس کا خیال اب تک مجھ پر اثر کرتا ہے، وہ شفقت اور رقت، روحانیت وانسانیت کی دیوی ہے جسے ماں — معاف کیجیے میں اب کچھ نہیں لکھ سکتا: اس لفظ کے آتے ہی میں دھڑکنے لگا! دھڑک لوں تو لکھوں..... کہتے ہیں: حسن میں نے سیکڑوں طرح کے دیکھے، اور سب میں کشش پائی؛ لیکن جتنی کشش اس حسین اور نرم شے میں دیکھی کسی میں نہ دیکھی۔ قدرت کی یہ سب سے نرم اور شفیق چیز مجھے بہت ہی پیاری معلوم ہوتی تھی، اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں اس کے پیارے چہرے کو دیکھنے کے لیے رو دیا ہوں اور مجھے گود میں اٹھا لیا گیا ہے، اور یہ خیال کر کے کہ میں بھوکا ہوں مجھے دودھ پلایا گیا ہے، حالانکہ اس کی بالکل ضرورت نہ تھی۔

میں بس اُس کے دیکھنے، گھنٹوں اُس فرحت بخش، طمانیت بخش، محبت پاش، اُلفت انگیز چہرے کو —— اس چہرے کو جو مجھے عالمِ لاہوتی کی صُورتوں کی جنہیں میں ابھی چھوڑ کے آیا تھا، یاد دلاتا تھا، دیکھنے کا خواہشمند تھا، کبھی میں اُس حسین شے کی سینے سے لپٹنے کی خواہش کرتا تھا لیکن کر نہیں سکتا تھا، صِرف ہُمکتا تھا، اور وہ حُسن کی دیوی، وُہ شفقت و رُوحانیت کی پری، خُدا ہی جانتا ہے میری خواہش کو کس طرح سمجھ لیتی تھی اور مجھے سینے سے لگا لیتی تھی، اور میں اُس وقت وُہ خوشی محسوس کرتا تھا جو دُنیا کی تمام خوشیوں سے بالاتر ہے، میں جب اُس کے سینے سے لگتا تھا تو مجھے معلوم ہوتا تھا اور یہ معلوم ہو کے مجھے کیسی خوشی ہوتی تھی کہ میں اس کے سینے میں بھی دھڑک رہا ہوں، وہاں بھی تڑپ رہا ہوں۔

دُوسری حسین اور خوبصورت چیز جس نے مجھے اپنی طرف کھینچا وُہ شمع تھی یہ نورِ عریاں مجھے گھنٹوں محوِ حیرت رکھتا تھا۔ اور کہیں قریب ہُوا، تو مَیں اس سے ملنے کے لئے اُس سے لپٹنے کے لئے بے اختیار اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا۔ لیکن یہ کیا؟ مجھے روکتے تھے۔ کیوں؟ کیوں مجھے اُس حسین شے سے ملنے نہیں دیتے تھے؟ اِس لئے کہ پہلی کی طرح ہر حسین شے شفیق نہیں۔ یہ حقیقت، یہ دل شکن حقیقت مجھے بعد میں معلوم ہُوئی، اچھا ہوتا جب ہی معلوم ہو جاتی چاند — وُہ بیجان مخلوق میں سب سے زیادہ طرب انگیز چیز یعنی چودھویں رات کا چاند — تو مجھے بالکل بیتاب کر دیتا تھا۔ اُسے بھی پکڑنے، اس سے بھی ملنے کی خواہش ہوتی تھی۔ مَیں اُسے اپنے پاس، اپنی طرف متوجہ سمجھتا تھا، سب کہتے تھے، "دیکھو دیکھو، کیسا ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے، آنکھ بھی

نہیں جھپکتی"، مَیں اُسے دیکھ دیکھ کے کِھل کِھلا کر ہنس پڑتا تھا گویا
اُسے بھی اپنی طرف مائل پاتا تھا، اور پھر اُسے پکڑنے کے لئے
ہاتھ بڑھاتا تھا۔ مگر آہ! چاند دُور تھا حُسن دھوکا بھی دیتا ہے۔
بس یہ زمانہ میری خوشی کا زمانہ تھا۔ مَیں حسینوں سے گھرا رہتا
تھا۔ ہوا میں پریاں میرے پاس آیا کرتی تھیں اور مجھ سے
باتیں کیا کرتی تھیں، اور لطیفے کہہ کہہ کے مجھے ہنساتی تھیں
فرشتے ایک زرّیں سیڑھی پر آسمان سے اُتر کے میرے
پاس آتے تھے، مجھ سے سرگوشیاں کرتے تھے اور مجھے
گدگدا کے بھاگ جاتے تھے۔ سیڑھی پر سے چڑھنے اور
اُترنے کا تانتا بندھا رہتا تھا، اور مَیں انہیں دیکھا کرتا
تھا، گھر میں حسین، پاکیزہ، اور باعصمت عورتیں مجھے
گھیرے رکھتی تھیں، مَیں جس کی گود میں چاہتا جاتا، اور
خوشی، خوشی، قبول کیا جاتا تھا، جس کے گالوں پر چاہتا

ہاتھ پھیرتا اور سب ہنستے تھے ؛ جس کا چاہتا بوسہ لیتا، اور
سب مجھے چومتے تھے۔

۳ - اس پہنائے زندگی میں، میں نے چند قدم اور ڈالے
اب رنگ برنگ کی تیتریاں مجھے اپنی طرف کھینچتی
تھیں، میں اُنکی طرف دوڑتا تھا، اور وُہ اُڑ جاتی تھیں
حُسن کی بے اِعتنائی دیکھی ؟

ایک دِن ایک پاک، سفید و بُرّاق کبوتر میرے
ہاتھ میں آگیا! میں فرطِ محبّت سے اُسے بھینچتا تھا،
اُسے چومتا تھا، لیکن وُہ پھڑ پھڑا کے اور میرے ہاتھوں
سے اپنے تئیں چھڑا کے اُڑ گیا۔ حُسن قدر ناشناس ہے۔

ابھی میں کم عمر ہی تھا کہ مجھے ایک اَور خوفناک حقیقت
معلوم ہُوئی، ہم چند نو عمر دل زمین پر بیٹھے ہُوئے کھیل
رہے تھے؛ لڑکے بھی تھے، لڑکیاں بھی تھیں، مٹّی کے

گھروندے بنا رہے تھے، میرے پاس ایک حسین شاطر لڑکی بیٹھی تھی۔ ہم گھروندے بھی بناتے جاتے تھے، اور آپس میں باتیں بھی کرتے جاتے تھے؛ نمعلوم اُس نے کونسی ایسی بات کہی کہ مجھے بہت ہی بھلی معلوم ہوئی، اور مَیں نے اُس سے بے اختیار ہو کر ایک بوسہ مانگا۔ یا تو وُہ مجھ سے ایسی گھُل مِل کے باتیں کر رہی تھی، یا اس سوال سے ایسا مزاج برہم ہوا، اور اُس نے مجھے ایسے زور سے جھڑکا، اس شدّت سے ڈانٹا کہ مَیں کانپ اُٹھا، اور اب بھی جب خیال آتا ہے تو وحشت زدہ ہو جاتا ہوں؛ اللہ رے حُسن، تیرا غرور! لیکن نہیں، صنعتِ خالق میں عورت کے سوا سب سے زیادہ پیاری صنعت، پھُول، سے مجھے شکایت نہیں۔ اُس نے مجھ سے اجتناب نہیں کیا؛ بلکہ میری ہی طرف سے اُس پر زیادتی ہوئی،

بجائے اس کے کہ وہ مجھے توڑے ہیں اُسے توڑتا تھا، پھول کبھی دل شکن نہیں ہوا، میں اکثر گلچین بنا۔

کہا جاتا ہی کہ میں رئیس اعضا ہوں، خاک بھی نہیں۔ اگر میں رئیس اعضا ہوں، تو مثالاً میں جب اُس حُسن کی دیوی کو دیکھکر غش ہو جاتا ہوں اور حکم کرتا ہوں: "چلو اُس کی پرستش کریں، اُس کے قدموں پر اپنے تئیں ڈالدیں" کیا ہوتا ہی میری ریاست دھری رہ جاتی ہی۔ رئیس اعضا کی کوئی نہیں سُنتا۔ دماغ (وہ مشیر باتدبیر جن سے خُدا سمجھے جنھیں مُصلحت نہیں "بُری بات ہی" کے سوا اور کچھ آتا ہی نہیں) فرمانے لگتے ہیں: "بُری بات ہی، عیب کی بات ہی، لوگ کیا کہینگے، مانا کہ تم بُرے خیالات سے پاک ہو لیکن دُنیا پر کیسے ثابت کروگے" پاؤں زمین میں گڑ جاتے ہیں، میں وہیں پس کے اور غصّے میں خُون ہو کے رہ جاتا ہوں۔

۴۔ ابتدائے آفرینش عالم سے ابتک لاتعداد تجربے
مَیں نے کئے اور بیشمار اشخاص سے پالا پڑا، کسی کو دوست
پایا، کسی کو دشمن، کسی کو میری طرف سے بے پروا۔
اُنھیں، جنہوں نے مجھے اپنی طرف کھینچا، مَیں کبھی بھولوں گا
تھوڑا ہی۔ نجد میں مجھے لیلا نے بہت پریشان کیا، ایران
میں شیریں کے ہاتھوں میں بہت بھٹکا۔ مگر آہ! شکنتلا! شکنتلا!
وُہ مجھ پر مہربان تھی، لیکن او جیلن! تو بے پروا تھی اور کیسی
بے پروا کہ لاکھوں خلق خُدا کا خون کرا گئی۔
سوانح عمری میں حقیقت سے گریز نہ کرنی چاہئے حقیقت
یہ ہے کہ بعض کو مَیں نے بھی تباہ کر دیا، جو ناچ چاہا انہیں نچایا۔
قیس عامر کا جب خیال آتا ہے تو مَیں بہت ہی کُڑھتا ہُوں۔ فرہاد
کی زندگی تلخ کر دی۔ ہند کے بادشاہ جہانگیر کو بھی مَیں نے
بہت ستایا۔

کی غرض سے نہیں، کیونکہ اس کی طاقت نہیں، بلکہ استرحام،
اِلتجا کی نیّت سے — تو حملہ آوروں کا پتہ نہیں۔ چشم زدن
میں غائب۔ غُرفہ بند، گھونگٹ کھینچا ہوا، نقاب پڑی ہوئی ہے؛
گویا کبھی حملہ ہُوا ہی نہ تھا۔ یہ انصاف ہے؟ مانا کہ الحربُ خدعۃ
لیکن بہادر للکار کے، خبردار کر کے حملہ کرتے ہیں۔

پھر مشرق جیسا وسیع مُلک، اور ہر جگہ مجھے پھانسنے کے
لئے جال پھیلے ہُوئے ہیں۔ ایک دن میں خیال میں مستغرق
دُنیا و ما فیہا سے بیخبر، اپنی طرف سے اور کُل عالم سے مطمئن اور
شاد جا رہا تھا کہ یکایک ایک اندھیرے گھُپ میں داخل ہو گیا،
اس اندھیرے گھُپ میں جال، اور وُہ بھی کالا، پھیلا ہوا ہے!
اب جتنی نکلنے کی کوشش کرتا ہوں، اُتنا ہی اور پھنستا جاتا ہوں،
جتنا تڑپ کے باہر آنا چاہتا ہوں، اتنے ہی جال کے بند
مجھے گھیرے لیتے ہیں۔ یا اللہ! مَیں کس بلا میں پھنس گیا!

جب مَیں تھک گیا، تو رضا بقضا، مَیں نے تحصیل لاحاصل
کی کوشش چھوڑ دی، اندھیرا زیادہ تھا، پہلے تو مجھے دکھائی
نہ دیتا تھا، جب نظر اِس اندھیرے کی عادی ہو گئی تو میں نے
دیکھا کہ ایک مَیں ہی اکیلا یہاں نہیں ہُوں، بلکہ اس جال میں
اَور بہت سے دِل پھنسے ہُوئے ہیں. اِس سے کچھ خاطر
جمع ہُوئی اور خیال کیا کہ ان لوگوں سے مل کے کوئی تدبیر
نکلنے کی کرینگے. اِس لئے مَیں نے اُن سے مخاطب ہو کے
کہا: بھائیو! جس مصیبت میں مُبتلا ہُوں، اُس میں تم مجھ سے
پہلے پھنسے ہو، بہر حال اس سے خلاصی پانے کی کوشش
کرنی چاہئے. شاعر نے

دو دِل یک شود بشکند کوہ را پراگندگی آرد انبوہ را

کہا ہے، اور ہم تو دو دِل نہیں، اگر میرا اندازہ غلط
نہیں تو سیکڑوں دِل ہیں، اور یہ پہاڑ نہیں، نہایت باریک

جال ہی۔ یا اللہ کہہ کے، سب ایک ساتھ جست کریں تو کیا عجب کہ اس جال کو توڑ دیں اور رہائی پائیں"۔

عشق اسیری مَیں نے یہیں دیکھا۔ میری اس معقول تجویز کو سُننا اور اُس پر عمل کرنا کیسا، سب نے مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں: تم سے کس نے کہا تھا کہ تم یہاں آؤ اور آئے تھے تو ناصح بنکے تو نہ آئے ہوتے۔ اِس دھوکے میں ہم نہ آئینگے۔ بڑے آئے باتیں بنانے والے۔ ہم بھی قائل ہیں، کیا ترکیب سوچی ہی۔ ہمیں باہر نکال کے، خود اکیلے یہاں رہنا چاہتے ہیں، ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! مگر

"برو ایں دام بر مُرغِ دگر نہ   کہ عُنقا را بلند است آشیانہ"

مجھے نہایت غُصّہ آیا، مگر چُپ ہو رہا، اکیلا تھا کیا کرتا۔

لیکن تعجب کی بات سُنئے، کچھ عرصہ یہاں رہتا تھا کہ راقم بھی اِس اسارت سے محبت کرنے لگے۔ جتنے جال

کے بند کھینچے جائیں، اتنے ہی ہم خوش ہوتے جائیں خدا سے دُعا مانگیں کہ الٰہی یہ بند کبھی ڈھیلے نہ ہوں، بلکہ اور تنگ ہوں، تاہم کبھی کبھی اپنی حالت پر افسوس بھی آتا تھا، اور چھٹکارا پانے کی خواہش ہوتی تھی۔

ایک دن عزم بالجزم کر کے، اور نہایت زور سے پھڑپھڑا کے، میں وہاں سے نکل آیا، باہر آیا تو معلوم ہوا کہ میں ظلمات گیسو میں پھنس گیا تھا؛ اس رہائی پر خدا کا شکر کر رہا تھا۔ اندھیرے سے نکل کے روشنی میں آیا تھا، مگر یہاں قدم قدم پر میرا پاؤں پھسل جاتا، (زمین نہایت چکنی تھی) کہ یکایک اڑا اڑا دھم۔

....

میں ایک کنوئیں تھا۔ یہاں بھی ظلمات گیسو کی طرح اور بہت سے دل تھے۔ اب چونکہ مجھے ان حضرات کا تجربہ ہو گیا تھا، میں نے پہلے کی طرح ان کو سمجھانے کی غلطی

نہیں کی، بلکہ اُن سے معذرت چاہی اور کہا کہ "میں مخل ہوا، مگر میں عمداً نہیں آیا، اُمید ہے کہ معاف فرمایا جاؤنگا" نیز یہ کہ "میں یہاں سے نکلنے کی جتنی جلد ممکن ہوگا، کوشش کرونگا"، یہاں اس قدر روشنی تھی کہ میری آنکھ خیرہ ہوئی جاتی تھی۔ اور اس پر ستم یہ کہ کنوئیں کے اوپر برابر بجلی چمکتی تھی، لیکن بجلی کے چمک کے ساتھ گرج نہ تھی، بلکہ نہایت لطیف، لوچدار، نغمہ ساں آواز جسے ہنسی کہہ سکتے ہیں آتی تھی یہاں سے معلوم نہیں، میں نے کس طرح نجات پائی، میں تو سمجھتا ہوں محض تائید غیبی تھی۔ نکلا تو معلوم ہوا کہ میں خوش قسمتوں میں سے ہوں، ورنہ چاہِ ذقن میں (قارئین، سمجھ ہی گئے ہونگے، کہ میں رُخساروں پر سے پھسل کے چاہِ ذقن میں گر پڑا تھا) گر کے نکلنا دشوار ہے۔ برقِ تبسم اور نغمۂ خندہ پاگل کر دیتے ہیں۔

مشرق میں میں نے اِس قدر ٹھوکریں کھائی تھیں کہ میں یہاں سے بھاگا. مغرب میں گیا. سوچا یہاں آرام وسکون نصیب ہوگا. مگر آرام وسکون کیسا! یہاں بھی وہی بدنظمی، وہی لُوٹ. بدنظمی سہی، لُوٹ سہی، پھر بھی مشرق کے برابر، مجھے مغرب سے شکایت نہیں یہاں، لُوٹ ہی، قزاقی ہی، ٹھگی نہیں. یہاں لٹیرے ڈنکے کی چوٹ ڈاکا ڈالتے ہیں.

یہاں میں جہاں جاتا تھا، تیروں کی بوچھاڑ مجھ پر ہوتی تھی، لیکن مجھے خبر بھی دیدی جاتی تھی کہ "ہم تیر برساتے ہیں، بچ سکتے ہو تو بچو، بھاگو یا سینہ سپر ہو" یہاں تیر انداز، تیر چھوڑ کے غائب نہیں ہوجاتے تھے، بلکہ اگر میں پوچھتا کہ کس نے تیر مارا؟ تو جواب کڑک کے ملتا: "ہم نے"

"کیوں"

"ہمارا کام یہی ہے، ہم اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں؛ اور اپنی

تو مشق تیر اندازی ہی"۔

"ابھی صرف مشق ہی ہو رہی ہی؟"

"بیشک ابھی صرف مشق ہی ہو رہی ہی، جب قادر انداز ہو جاتے ہیں تو وہ تیر مارتے ہیں کہ کسی کو اتنی قوت نہیں رہتی کہ ہم سے سوال کر سکے۔ اور ہم کبھی آڑ کے پیچھے ہو کر تیر نہیں مارتے، یہ بزدلی ہی اور ہمارے اصولِ جنگ کے خلاف ہی۔ زیادہ سے زیادہ آڑ اگر ہم کبھی کرتے ہیں تو صرف دستی پنکھے کی کرتے ہیں، اور بس، اور یہ بھی لڑائی کی شان بڑہانے کے لئے، ورنہ کوئی ضرورت نہیں"۔

"تو آپ اس بات سے شرماتے نہیں، کہ آپ تیر انداز ہیں، قزاق ہیں"؟

"پھر وہی کج بحثی، کہ تو دیا کہ ہمارا کام یہی ہی، قدرت نے ہم کو اسی لئے پیدا کیا ہی۔ کیا آفتاب کا کام ضیا پاشی نہیں ہی؟

اب اگر چمگادڑ کہے کہ تو نہ نکل، مَیں تاب نہیں لا سکتی شبنم کہے کہ شرر فشاں نہو مَیں فنا ہو جاؤنگی، تو وُہ مظہرِ شانِ کبریائی منبع نُور و روشنائی یعنی عظمت و جلالت والا، شوکت و حشمت والا آفتاب اُنکی نہیں سُنیگا، یہی نہیں بلکہ نہ سُننے پر مجبور ہے قانونِ قدرت کا تابع ہے"۔

"مگر گستاخی معاف! وُہ بھی آپ کے ہی ہمجنس ہیں جو مشرق میں چھپ چھپ کر، ڈر ڈر کے، اِدھر اُدھر دیکھ کے کہ کوئی دیکھتا نہو، تیر مارتے ہیں۔ یہ کیوں"؟

"دیکھا! تیر مارنے سے وُہ بھی نہیں چُوکتے! اب وہ اپنی اِس خصلت سے نادم کیوں نظر آتے ہیں، یہ ہم نہیں جانتے! وُہ جانیں اور اُن کے تیر کھانے والے جانیں"۔

مگر مغرب میں سب سے زیادہ ظالم (فریاد، فریاد اُنکے ستموں سے) وُہ تھے جو تیر مارتے تھے، برچھیاں گھبوتے

تھے، لیکن جب میں شکایت کرتا تھا تو صاف مکر جاتے تھے: "ہم نے نہیں مارا" پہلے تو میں اسے بناوٹ سمجھا، ملتجی نظروں سے اُنکی طرف دیکھا اور عرض کیا: "میں آپ کو جھوٹا نہیں بنانا چاہتا، لیکن میں نے دیکھا کہ آپ نے تیر مارے"۔

میری ملتجی آنکھوں کا اُن آنکھوں سے ملنا تھا، کہ سیکڑوں ہزاروں تیروں کی پے در پے بوچھاڑ پڑنے لگی، مگر اُنکو اس وقت عین اس بوچھاڑ کے وقت بھی اپنی بے تقصیری پر اصرار تھا۔

یہ ہم پر بہتان ہی، تیر ویر کیسا؟ (اور آنکھوں میں آنسو بھر لاکے) ہم کہیں نہیں جانتے' اور ہزاروں تیر برسا دیے۔

"تم اس قدر زخمی کیوں نظر آتے ہو، کس نے گھائل کیا؟" اور ایک نظر، ایک ترحم انگیز اور ہوش رُبا نظر ڈالی اور ایک لاکھ برچھوں سے مجھے چھلنی کر دیا۔

"ہے ہے، اس قدر نہ تڑاپو، کس بیرحم نے تمہیں خون میں شرابور کردیا"۔ مگر بجریا کی کٹریا سے اور کچوکے لگا دیئے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت میں اُنہیں اپنے ظلموں کی خبر نہیں، تیروں کی بوچھاڑ عمداً نہیں کی جاتی؛ بلکہ اپنے آپ ہوتی رہتی ہے۔ اُف! اُف! خدا، ان تیراندازوں سے پالا نہ ڈالے۔ کھُلے بند قزّاق، زخم لگا کے بھاگ جانیوالے قزّاق، یا ٹھگ! ان سب سے میں سینہ سپر ہو سکتا ہوں اور ہوا ہوں، لیکن اس تیسری صنف سے تاب مقاومت نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔

مغرب کیا، ساری دنیا میں ہیں قدیم اہلِ یونان سے بہت خوش ہوں، انہیں تعقل (اور خدا اس لفظ کو دنیا سے اُٹھاوے) حکمت پر بہت توجہ تھی، لیکن میری غذا (حُسن) پر وہ اُس سے زیادہ متوجہ تھے۔

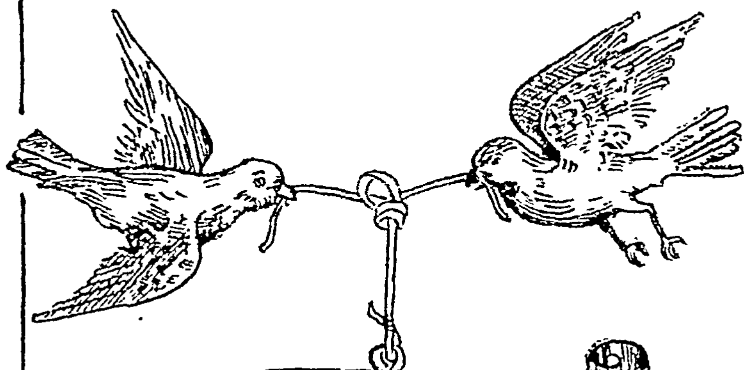
"وینس" وہیں نکلی، اور وہ اندھا، مگر نٹ کھٹ، شریر لڑکا "کیوپڈ" جو ایک ہاتھ میں تیر اور دوسرے ہاتھ میں کمان لئے، اور کندھوں میں پر لگائے اُڑتا پھرتا تھا، وہیں پیدا ہوا۔ وُہ مجھے زخمی کرتا تھا، لیکن مَیں بہت خوش ہوتا تھا، کیونکہ میرے مدِمقابل قزاقوں کو بھی وُہ نہیں چھوڑتا تھا اور جہنم میں جائیں آپ، اور بھاڑ میں جائے میری سوانح عمری وُہ سامنے سے اِک بدیعۂ خلقت، ایک آئینۂ حُسن و جاذبیت ایک مجسمۂ شعر و نزاکت، سمندِ ناز پر سوار، مجھے شکار کرنے کے لئے آ رہی ہے اور اب نہ مجھ میں اتنی طاقت، اور نہ اُس کی خواہش ہی کہ مَیں اپنے حالات بیان کروں آ، آ، کہ مَیں تیری پرستش کروں

....

نوٹ از پرائیویٹ سکرٹری حضرت دل :۔ حضرت دل بھلے چنگے تھے اور اپنے حالات لکھا رہے تھے، کہ یکایک

از خود رفتہ ہوگئے، اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگے. افسوس ہے کہ یہ سوانح عمری ناتمام رہ گئی؛ تمام قارئین سے استدعا ہے کہ اُنکی صحت کے لئے دُعا کریں.





چڑیا چڑے کی کہانی

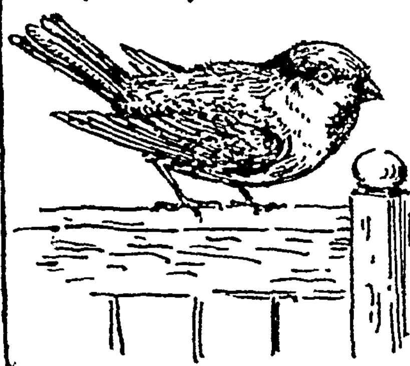
(چڑے کی زبانی)

"چوں چوچوں، چرچوں، سب غلط، سب جھوٹ! چڑیا چڑے کی کہانی بہت اِنسانوں نے لکھی ہی، مگر قلم در کفِ دشمن است. چوں، چوچوں، چوں، میری اور چڑیا کی لڑائی بہتان! چڑیا کا، آنکھیں دُکھنے کا بہانہ کرنا افترا! چوں چڑ چوں، چوں، چوں، آؤ، اب مَیں تمھیں چند باتیں سُناؤں کہ تمھاری آنکھیں کھُلیں.

حضرتِ انسان کو باتیں بنانی بہت آتی ہیں اور بس
مجھ کو خدا نے مشاہدہ کی قوت عطا کی ہے۔ ویسے دیکھو تو
میں بیوقوف، بھولا بھالا، اِدھر اُدھر پھدکتا نظر آتا ہوں
مگر میں دیکھتا سب کچھ ہوں، سمجھتا سب کچھ ہوں، کہتا بھی
سب کچھ ہوں مگر تم نہیں سمجھتے۔

میں دیکھتا ہوں، کہ خدا نے مجھے آزاد، آزادی طلب
اور آزادی پسند مخلوق بنایا ہے۔ پرندوں اور چرندوں میں
بہت سے ایسے ہیں کہ انسان سے بالکل نفرت کرتے ہیں
اور جنگلوں میں انسان کے گھونسلوں سے دور جا کے رہتے
ہیں، بعض بیوقوف ایسے ہیں، کہ انسانوں میں انسان کے
خادم ہو کے رہتے ہیں۔ مگر میں انسانوں کی کارستانیوں
کو دیکھنے کے لئے شہر میں رہتا ہوں، اُن کے بڑے
بڑے بھونڈے گھونسلوں میں اپنا پیارا، پیارا

چھوٹا، چھوٹا گھونسلا بناتا ہوں۔ لیکن وہ پکڑ کے مجھے رکھنا چاہیں تو کبھی نہیں رہتا۔ پنجرے میں بند کر کے رکھنے کی بات دوسری ہی یا میرے پر کاٹ دیں تو وہ اور ہی بات ہے، ورنہ میں کبھی حضرت انسان سے مانوس نہیں ہوتا۔ میں انہیں خود غرض سمجھتا ہوں اور پرلے سرے کا ظالم۔ مگر مجھے اپنی کہانی سنانی ہی، ضمناً حضرت انسان سے بھی دو دو باتیں ہو جائینگی (پھدک کے اور پروں کو پھلا کے) خدا کا شکر ہی کہ اُس نے مجھے ایسا اچھا لباس دیا: ایک حد تک خوبصورت مگر نہ اتنا کہ انسان کی حریص نگاہوں کا



ہدف بن جاؤں، جسم میں پھرتی دی کہ خوشی خوشی پھدکتا پھروں، چھوٹے پروں میں پرواز کی تیز طاقت دی کہ انسانوں کی رفیق

اُن کی ہمخصال، اُنکی چہیتی بلی کی دستبرد سے بچوں۔ جسم ایسا موزوں دیا کہ بیان نہیں ہوسکتا، نہ اتنا بڑا کہ شاہیں اور باز مجھ پر جھپٹیں جیسے وُہ کبوتر پر جھپٹتے ہیں، نہ اتنا چھوٹا کہ حشرات الارض کی طرح بالکل حقیر ہی ہوجاؤں اور کوئی مجھے دیکھے ہی نہیں۔

آواز کیسی اچھی، چوں، چوں، چڑچوں، چڑچوں۔ آپکے نزدیک اگر یہ خوش آیند نہ ہو تو نہ سہی، اور میں خوش ہوں کہ آپ اسے پسند نہیں کرتے، لیکن میرے ننھے دل کی خوشی اور طمانیت ظاہر کرنے کے لئے یہ بہت کافی ہے۔ چوں، چوں، چوں، چڑچوں۔ شکر ہے خدا کا کہ اُس نے بلبل کا ترانۂ شیریں اور نالۂ رنگیں مجھے نہیں دیا، ورنہ صیاد اور قفس ہی میرے رفیق ہوتے۔ بیوقوف بلبل کو دیکھئے قفس میں بیٹھ کے بھی گاتی ہے اور اپنی اِسارت پر دردانگیز

نہیں دل آویز نالے کرتی ہے اور نہیں سمجھتی کہ یہ اُس کی اسیری کو اور بڑھاتے ہیں۔ ~

گُل و گلچیں کا گلہ بلبل خوش لہجہ نہ کر
تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

اگر ذرا بھی عقل ہوتی تو قفس میں پہنچتے ہی خاموش ہو جاتی اور اُس وقت تک خاموش رہتی کہ یا قفس کھلتا یا موت آتی۔

مَیں اُڑتا ہوں، پھُدکتا ہوں، دانے چُگتا ہوں، مگر الحمدللہ کسی کو آزار نہیں دیتا، خُدا کی زمین سب کے لئے اور اُس کے دانے سب کے لئے ہیں، یہ فلسفہ قُدرت نے مجھے سمجھا دیا ہے؛ اور اس لئے مَیں سب سے کہتا ہوں آؤ، اور کھاؤ، اور خدا کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاؤ۔ جہاں بہت سے دانے ہوئے اور ہم اپنی تمام ہمجنسوں کے ساتھ پہنچے؛ پھر وہاں اگر اور مخلوق چُگ رہی ہو تو مَیں مُعترض نہیں ہوتا، کبوتر ہوں، مینائیں ہوں، فاختائیں ہوں؛

سب کو صلائے عام ہی. سب ساتھ آئیں اور کھائیں ہیں
اکل کھرا نہیں، تنہا خوری میری عادت نہیں .
حضرت انسان کی بعض باتوں پر تو مجھے بیساختہ ہنسی آتی
ہی: قہ، قہ قہ، چوں چڑچوں، چڑچوں چوں. کس قدر مغرور
مگر سادہ لوح جنس ہی. میرا نام گنجشکِ خانگی رکھا ہی، یعنی
جب انسان کے یہ گھونسلے جن میں وہ آجکل رہتے ہیں
نہ تھے، اور وہ بہائم کی طرح غاروں اور کھووں میں رہتے
تھے تو میں نہ تھا؟ میرا گھونسلا نہ تھا؟ یا کیا اب میں سوائے
اُن کے گھونسلوں کے کسی اور جگہ اپنا گھونسلا نہیں بناتا؟
اب بھی چمن، صحرا، مرغزار، وادی، درخت، جھاڑی،
میرے گھونسلے کے لئے ویسے ہی موجود ہیں جیسے انسان
کے گھونسلے .
میں تو اُنکے بیہنگم، موٹے بھدے گھونسلوں میں اپنا گھونسلا

صرف اس لئے بناتا ہوں کہ یہاں رہکر اس ریاکار مخلوق کی کرتوتوں کو اچھی طرح مشاہدہ کروں اور پھر اپنے ہمجنسوں میں بیٹھ کر ان خود بینوں، ان بیوقوف مغروروں کے اوپر ہنسوں۔ اگر میں انہیں انسان خانگی کہوں تو زیادہ زیبا ہے۔

پھر اُن کے گھونسلوں کا حال سُنیے۔ ایک بڑا ہے ایک چھوٹا ہے، ایک اُونچا ہے، ایک نیچا ہے۔ یہ کیوں؟ مساوات کیوں نہیں؟ اِسے تو میں سمجھتا ہوں کہ اُن کے گھونسلوں کے اندر کے خس و خاشاک، جنہیں انسان کیا کہتے ہیں بھول گیا، ہاں، میز کرسی فرش و فروش مختلف رنگ کے ہوں۔ کیونکہ میں بھی کہیں سے تاگا کہیں سے تنکا، کہیں سے پتّا لا کر گھونسلا بناتا ہوں، لیکن بڑائی چھوٹائی کیوں ہے؟ ہاں، ہاں خیال نہیں رہا

تھا، اس کی وجہ معلوم ہُوئی. مَیں نے دیکھا ہی: چھوٹے گھونسلے والا انسان بڑے گھونسلے والے اِنسان کے سامنے، سر جھکا کے، ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوتا ہی، اس کی خدمت کرتا ہی. لاحول ولاقوۃ. کس قدر بے غیرت مخلوق ہی، مَیں نہ اپنے ہمجنس کی اَور کسی نہ غیر جنس کی خدمت کرتا ہوں، اگر مار بھی ڈالو تو خدمت نہ کروں، اور کیوں کروں، خُدا کے فضل سے ہم سب مساوی ہیں، کسی کو ایک دُوسرے کی خدمت کرنے کی نہ ضرورت ہی نہ آرزو. اپنے بال بچّوں کی خدمت کے سوا، کسی کی خدمت کرنا، کسی کے گھونسلے پر جا کر دریُوزہ گری کرنا، عار کی بات ہی، ننگ کی بات ہی. مگر اِنسان ــــ وُہ مدعیٔ عقل احمق، جو اپنے تئیں درس آموزِ قدرت خیال کرتا ہی۔ اِس نُکتے کو نہیں سمجھتا.

ہائے ریاکار انسان! اس نے ایک لفظ نکالا ہی اور

اُس پر اسے بہت ناز ہی۔ کہتا ہی: "سولئے میرے کسی میں حیا نہیں، سب جاندار سوائے انسان کے بیحیا ہیں، حیا اور شرم کا احساس صرف مجھ میں ہی۔" اوڈینگ مارنیوالی مخلوق، بس، بس۔ جسے تو حیا کہتا ہی وُہ ریاکاری ہی۔

اِنسان چڑا اور انسان چڑیا، کبوتر چڑا، اور کبوتر چڑیا دانہ بدلی کرنے اور پوٹا بھرانے میں ایک ہیں۔ مَیں نہیں جانتا اِنسان نے یہ عادت کبوتر سے لی ہی، یا کبوتر نے اِنسان کی نقل اُتاری۔ مَیں اُس کی تحقیق نہیں کرسکتا کیونکہ کبوتر اگرچہ پرندہ ہی، لیکن ایسا احمق، قدرِ حُریت ناشناس پرندہ ہی کہ انسان سے بہت مانوس ہی؛ اور ایسا کاہل ہی کہ اپنے لئے گھونسلا بھی نہیں بناتا، اِنسان اُس کے لئے گھونسلا بناتا ہی؛ اور یہ اُس کے عوض میں اُس کا درم ناخریدہ غلام بن جاتا ہی۔ وُہ اُسے پکڑتا ہی، مگر پنجرے میں بند نہیں کرتا،

پھر بھی یہ اُس سے نفرت نہیں کرتا، اور اُڑ نہیں جاتا۔
لیکن کبوتر، گو اُسے رات دِن غٹر غوں کی فِکر میں لگانے
اور دانہ بدلی کرنے کے سوائے کوئی اَور کام نہیں (صبح
سے شام تک یہ حضرت دانہ بدلی کیا کرتے ہیں، اور خیال
رہے کہ دانہ بدلی بچّوں کا پوٹہ بھرنے کے لئے نہیں،
اگر ایسا ہوتا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، کیونکہ بیچارے
بچّے اُڑ نہیں سکتے؛ اور اُن کا پوٹہ ماں باپوں ہی کو بھرنا
پڑتا ہے؛ مگر کبوتر یُوں ہی بیفائدہ ایک دُوسرے سے
چونچ ملایا اور پھڑ پھڑایا کرتے ہیں، اور ایک منٹ دو منٹ
نہیں، گھنٹوں یُوں ہی کیا کرتے ہیں) گو کبوتر کو اِس کے
سوا کوئی اَور کام نہیں، تاہم — سادہ لوح اور صاف دِل
مخلوق! — وہ کبھی اِنسان کی طرح چھپ چھپ کے دانہ
بدلی نہیں کرتا۔

مگر حضرت انسان ! ان کا باوا آدم ہی نرالا ہی، دانہ بدلی میں یہ کبوتر سے کم نہیں، بلکہ بڑھے ہوئے ہی ہونگے، مگر وہی خود ایجاد حیا اور شرم کی پابندی سے اپنے گھونسلو میں، چھپ چھپ کے، لیکن پہلے کہہ چکا ہوں کہ وہ حیا شرم نہیں ہے، بلکہ وہ ریاکاری ہے جو گھونسلوں میں وہ چوری چھپے کرتے ہیں جسے وہ علانیہ نہیں کرسکتے!

کل ہی کی تو بات ہی، یہ تمھارے پڑوس کے گھونسلے میں کئی انسان چڑیا اور چڑے بیٹھے تھے، میں اوپر چھت میں تھا، وہ اپنی زبان میں چوں چوں کر رہے تھے، میں اپنی زبان میں چوں چوں کر رہا تھا، آہستہ آہستہ اس گھونسلے کے ایک حصہ میں سے جسے تم کمرہ کہتے ہو اور سب انسان تو چلے گئے، اور بس۔ ایک انسان چڑا، اور ایک انسان

چڑیا۔ یا تمہاری زبان میں میاں بی بی۔ رہ گئے۔ اب اُنہوں نے
دانہ بدلی شروع کر دی اور پھر وُہی پیار محبت کی باتیں ہونے
لگیں؛ تم کہو گے کہ اِس میں ریاکاری کی کونسی بات ہُوئی؟
سُنئے: جب اُن کے ہمجنس بیٹھے تھے، اُس وقت اُنہوں نے
یہ باتیں کیوں رَوا نہ رکھیں؟ اگر کہو شرم کی وجہ سے؛ بہت
خوب! تو بعد میں بھی تو مَیں کمرے میں موجود تھا؛ پہلے
مجھے خیال ہوا تھا کہ شاید اُنہوں نے مجھے دیکھا نہیں؛
اِس لئے مَیں اُڑ کے، اور پھڑ پھڑ کر کے، اُن کے قریب
میز پر جا بیٹھا، کُرسی پر جا بیٹھا، وہاں سے اُڑ کے دیوار
میں جو تصویر لگی ہُوئی تھی، اُس کے چوکھٹے پر جا بیٹھا؛
تب بھی اُنہیں کچھ اثر نہیں؛ اپنے کام سے کام؛ آخر
مَیں نے زور سے چِلّانا شروع کیا: "مَیں یہاں ہُوں،
مَیں یہاں ہُوں، چوں، چوں، چوں" مگر بیحیائی دیکھئے،

مجھے دیکھ کے دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ مجھے نہایت غصہ آیا، اور میں اُنکو گالیاں دیتا ہوا، پھر سے کمرے سے باہر اُڑ گیا۔ فرمائیے! آپ ہی فرمائیے، آپ اِسے کیا کہتے ہیں حیا یا ریا کاری؟

اِسی ایک بات پر کیا منحصر ہے؛ حضرت اِنسان کے ڈھنگوں سے میں خوب واقف ہوں کوئی مجھ سے پوچھے۔ کوئی لاکھ بار تو میں نے اِنسان چڑے کو اِنسان چڑیا کے سامنے ادعائے وفاداری کرتے سُنا ہوگا:

"آہ! میں تمہیں چاہتا ہوں، تمہارے سوا حور بھی ہو تو اُس پر آنکھ نہ ڈالوں" بیچاری بھولی بھالی چڑیا اِسے یقین کرتی ہے، اور محبت کی آنکھوں سے ۔ اُن آنکھوں سے جن سے آنسو اور احسانمندی ٹپکتی ہوتی ہیں۔ اُسے دیکھتی ہے۔ یہ ایسا منظر تھا، کہ شروع شروع میں اُس سے

بہت متاثر ہوتا تھا۔ لیکن میں کیا دیکھتا ہوں کہ وُہی
اِنسان چڑا، دوسرے دِن دوسرے گھونسلے میں
دُوسری چڑیا سے ــ پہلی چڑیا کی نظروں سے دُور ــ
کہہ رہا ہے: "آہ! مَیں تمہیں چاہتا ہوں تمہارے سوا حُور
بھی ہو تو اُس پر آنکھ نہ ڈالوں" اور یہ بیچاری معصوم چڑیا
بھی، اس دھوکے باز چڑے کے پھندے میں پھنس جاتی
ہی، اور اپنا محبت بھرا دل اس کے سپرد کر دیتی ہی۔
تیسرے دِن کیا دیکھتا ہوں کہ وُہی چڑا ایک اَور گھونسلے
میں، ایک تیسری چڑیا سے کہہ رہا ہی: "آہ! مَیں تمہیں چاہتا
ہوں، تمہارے سوا حور بھی ہو تو اُس پر آنکھ نہ ڈالوں"۔
اور یہ تیسری تشنۂ محبت بھی اِن باتوں پر یقین کر کے،
دِل ہار بیٹھتی ہی۔ آخر کار، ایک دن آتا ہی کہ تینوں کو
حقیقت معلوم ہوتی ہی، اور ــ یا کنوؤں سے چند جانیں ختم

انسان چڑیوں کی لاشیں نکلتی ہیں، یا افیم انہیں ابدی نیند سُلا دیتی ہے!

دِل چاہتا ہے اس ناپاک مخلوق کو ٹھونگیں مار مار کے مار ڈالو۔
یہاں چڑیا بول اُٹھی: "چڑے کا قطع کلام تو ہوتا ہی، مگر مجھے یہ کہنا ہے کہ انسان چڑیا کا بھولا پن یہیں ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے۔ میرا چڑا — میں اُس کے سامنے کہتی ہوں کچھ ڈرتی تھوڑا ہی ہوں — رات دِن مجھ سے کہا کرتا ہے: "تم بیحد خوبصورت ہو، تمہاری برابر دُنیا میں کوئی خوبصورت نہیں" مگر خوشامد سے میرا دماغ نہیں چل جاتا، میں اس کان سُنتی ہوں اور اُس کان اُڑا دیتی ہوں کیونکہ گو اُس کی نظروں میں میں خوبصورت ہوں لیکن حقیقت میں خوبصورت نہیں۔ اسے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ مگر کہیں آدم نے حوّا سے کہدیا تھا کہ تم بہت خوبصورت ہو" بس وہ دِن اور آج کا دِن؛

کہ انسان چڑیا کے سامنے سے آئینہ نہیں ہٹتا، آئینہ نہیں تو آرسی ہی، آرسی نہیں تو پانی ہیں اپنا عکس دیکھا جاتا ہے، اور اپنے عکس کو دیکھ دیکھ کے خود ہی جھوما کرتی ہے، اور مارے غرور کے زمین پر قدم نہیں رکھتی۔ یہ نہیں سمجھتی کہ یہ سب چڑے کی خوشامد کی باتیں ہیں اور بس۔

پھر گھر میں بیٹھی، چڑے کو نیک اور اپنا عاشق سمجھا کرتی ہے۔ اور چڑا، اُس کی غیبت میں رنگ رلیاں مناتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتی کہ "مالِ عرب پیشِ عرب" ہی رہے تو اچھا ہے۔ میں اس نکتہ کو سمجھتی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں ہر وقت اپنے چڑے کے ساتھ ہوں، یہاں تک کہ تدارکِ معیشت میں بھی برابر کی شریک ہوں، میں چڑے کو فخر و تفوق کا موقع ہی نہیں دیتی۔ چڑے نے پھر کہنا شروع کیا: - "اب مجھے دیکھئے۔ یہ کچھ غرور اور ستائش کے

کے طور پر نہیں کہتا اور نہ اپنی پیاری چڑیا کو سنانے کے لئے کہتا ہوں، بلکہ واقعہ بیان کرتا ہوں کہ میں ایک ـ بس ایک ـ چڑیا کو دل دیتا ہوں، ایک کعبہ کا طواف کرتا ہوں، ایک دیوی کے گرد پھرتا ہوں، میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں، اور اُس کے ساتھ پیمانِ وفا باندھتا ہوں۔ اور اُس پیمان کو نہیں توڑتا، مگر یہ کہ موت آ کے اُسے توڑے۔

میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں اور اُسے پورا اختیار دیتا ہوں کہ میری کُل حرکتوں کی نگرانی کرے، میں جہاں جاؤں اور جس مجلس میں پہنچوں، میرے ساتھ ہو، لڑائی لڑوں تو میرا دل بڑھائے، چہکوں تو میرا نغمہ سُنے۔ انسانوں کی طرح ہم علیحدہ علیحدہ زندگی بسر نہیں کرتے،

میں ـ (سچ کہنا چاہیئے)ـ کبھی کبھی اپنے پر دوسری چڑیا کے لئے بھی پھیلا دیتا ہوں، لیکن یہ محض شوخی اور کلیل ہوتی ہے،

اِس سے کوئی خاص ارادہ مقصود نہیں ہوتا۔ اور میری چڑیا بھی اسے جانتی ہے، اِس لئے وہ نہ ناراض ہوتی ہے اور نہ میری طرف سے اُس کے دل میں شبہ بیٹھتا ہے۔

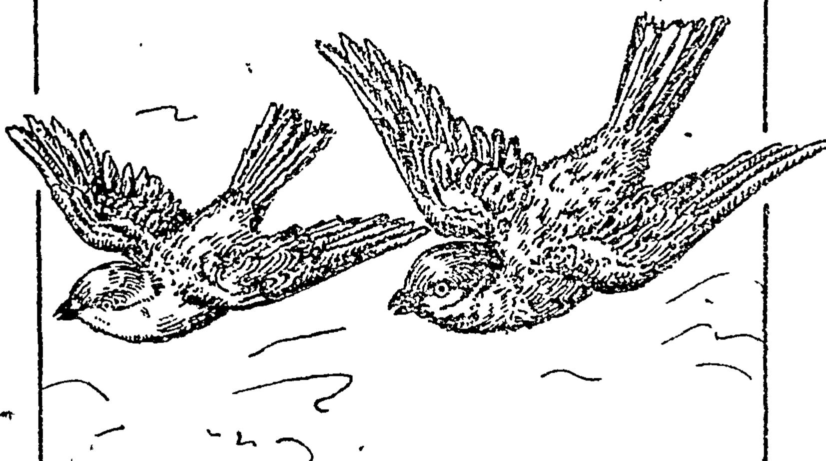
لو، تم سے باتیں کرنے میں، مَیں بھول ہی گیا کہ مجھ پر فرائض پڑے ہیں۔ مَیں انسان باپوں کی طرح نہیں کہ اکثر اپنے عیش میں اپنے بال بچّوں کا خیال تک نہیں کرتے، بلکہ بعض تو ہمیشہ کے لئے انہیں چھوڑ دیتے ہیں، نان و نفقہ بھی نہیں دیتے۔ مَیں ایسا بے غیرت نہیں۔ جب ان بچّوں کو دُنیا میں لانیکا مَیں ہی باعث ہوا ہوں تو جب تک خود نہ اُڑ سکیں، مَیں خود بھوکا رہوں گا، لیکن اُن کا پوٹا بھرونگا۔ بڑی دیر ہوگئی، وُہ چونچ کھولے اِنتظار میں بیٹھے ہونگے۔ ہاں ذرا مجھے دانے، یا روٹی کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر توڑ ڈالدو۔

آہا! تم نے میری خواہش پُوری کی، شکریہ ادا کرتا ہوں، خُدا تمہارے، اور تمہارے بال بچّوں کے پوٹوں کو بھی ہمیشہ بھرا رکھے۔

لو اب جاتے ہیں،

پھر ملیں گے اگر خُدا لایا"

اور یہ کہتے ہوئے دونوں پُھر سے اُڑ گئے۔



نکاحِ ثانی

گھڑی، گھرر، گھرر کرکے بجی، دونوں نے ایک ساتھ نظریں اٹھائیں۔ نوجوان عورت انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ایک خط پڑھ رہی تھی، چھوٹی لڑکی گڑیا کو بائیں ہاتھ میں لئے اور دائیں ہاتھ کی انگلی اُردو کی پہلی کتاب کے ایک سطر پر رکھے، گڑیا کو وُہ سبق جو خود اُس نے آج پڑھا تھا...... پڑھا رہی تھی: "کُتا بھونکتا ہے...... بلی میاؤں میاؤں کرتی ہے...... اُونٹ بلبلاتا ہے"...... دونوں کی آنکھیں ایک دم اٹھیں اور گھڑی پر پڑیں۔ نوجوان عورت نے اپنے دل میں کہا۔ "لو، نَو بج گئے"۔ لڑکی نے گھڑی پر سے ماں کے چہرے پر نظر ڈالی، اور بات کے لئے بہانہ ڈھونڈھ کے کہنے لگی: اماں

جان، گھڑی نو دفعہ بجی نا"؟

ماں نے مُنہ سے کچھ نہ کہہ کے، مگر ذرا سر ہلا کے، گویا "ہاں" کہا۔ بچّی نے تھوڑے سے تردّد کے بعد پھر پوچھا: "ابّا جان کا انتظار کب تک کرینگے"؟ ماں نے اس کا جواب بھی کچھ نہ دیا۔

ہاں انتظار کرینگے، یُوں ہی اِنتظار کرینگے۔ عورت نے کاغذ کو پھر اُٹھایا۔ آہ! اگر اب بھی آئے، اور نگاہِ محبّت سے اُسے دیکھے تو وُہ، اس گمنام، بے دستخط کے کاغذ کو پھاڑ ڈالیگی، ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گی، اور بالکل ضائع کر دینے کے لئے انگیٹھی میں ڈال کے راکھ کر دیگی، اُس پر یقین نہ کرے گی، اپنے شوہر کی بیوفائی کی اطّلاع دینے والے کاغذ پر ذرا سا بھی یقین نہ کریگی۔

"یا اللہ! کیا یہ ممکن ہی؟ تو یُوں کہئے، یہ جوہر دوسرے

تیسرے رات رات بھر غائب ہوجایا کرتے ہیں ! یہ سب بیوفائی کا نتیجہ ہے ، یہ سب کسی بیوا کو دِل دینے کے باعث ہے۔ یہ جو کہا جایا کرتا تھا ، کہ آج کچہری کے فلاں دوست کے ہاں دعوت ہے ، شاید رات کو نہ آسکوں ، آج کمپنی باغ میں بینڈ سُنتا رہا ، اِس لئے دیر ہوگئی ، آج فلاں جگہ جلسہ تھا ، اِس لئے جلد نہ آسکا ، یہ سب عُذر جنہیں وُہ یقین تو کیا کرتی تھی ، مگر دھڑکتے ہُوئے دِل سے کہ کہیں جھُوٹ نہ ہوں ، یہ سب عُذر جھُوٹ ہی تھے ، اور صِرف یہ کاغذ ، یہ ناپاک عبارت جو اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کی ہنسی اُڑاتی معلوم ہوتی ہے ، صحیح ہے۔ یہ کاغذ ! وُہ تو اسکا نام ، اس کا کوٹھا ، اور تمام تفصیلات تک بتاتا ہے ، کہتا ہے : "اگر چاہو تحقیق کر لو" یعنی بالکل صحیح ہے ؟ اِنکار کی مجال نہیں ، اس کے جھُوٹ ہونے کا اِحتمال نہیں ؟ یہ خیال اُسے گویا شکنجہ میں دبا دبا کر پیسے

ڈالتا ہو۔

اور اُس وقت، ایک منٹ میں گذشتہ واقعات: ماضی کے شبریں پردے کو ہٹا کے ایک دم اُس کے سامنے آکھڑے ہُوئے: وُہ باتیں، وُہ عذر جو اُس نے اپنے شوہر کی زبان سے سُنے تھے اور مان لئے تھے؛ وُہ گراں واقعات جنہیں اُس نے تحمّل کیا تھا اور بھُول گئی تھی؛ وُہ لڑائیاں جو نمعلوم کیُوں اُن میں ہُوئی تھیں، باوجودیکہ خود اُس نے کبھی اپنے شوہر سے لڑنے کا ارادہ نہیں کیا تھا؛ وُہ تحقیریں اور چھوٹی چھوٹی اہانتیں جو اس کی کیجاتی تھیں اور جنھیں وُہ معاف کرچکی تھی اور بھُول چکی تھی؛ یہ سب پردۂ ماضی سے نکل کر قطار در قطار سامنے آکھڑی ہوئیں اور اپنے اصلی رنگ میں (اُس رنگ میں جن میں اُنھیں بھُولنا معاف کردینا، برداشت کرنا ممکن نہ تھا) اپنے تئیں

ظاہر کرنے لگیں۔

اور اس وقت وہ ان کے عذاب سے تنگ آکر، اور اُس کے جگر میں جو اختلاج پیدا ہو تا رہا تھا، اس سے مغلوب ہو کر اپنے ہاتھوں کو مَل رہی ہے، جسم تھرا رہا ہے۔ اپنی اُنگلیوں کو اس طرح اینٹھ رہی ہو گویا توڑ ڈالیگی؛ ہاتھوں کو اس طرح بڑھاتی ہو: گویا اپنے کندھوں سے اُکھاڑ دینا چاہتی ہے۔

چلّانے کے لئے، رونے کے لئے اُس کو بہت بڑی ضرورت محسوس ہوتی تھی، لیکن اس کاغذ پر یقین کرنا نہیں چاہتی تھی، یقین نہ کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اب اُس نے اپنی نگاہیں اس کاغذ پر سے اُٹھا کر، دیوار پر ڈالیں، جہاں کچھ اُونچے پر سائے میں شوہر کی تصویر لگی ہوئی تھی؛ گویا اس چہرہ میں، اس اہانت، اس بیوفائی کے جھوٹ

ہونے کی علامتیں دیکھنا چاہتی تھی ۔ اور اس وقت، چند منٹ میں اپنی بیاہی زندگی کو پھر دوبارہ بسر کر گئی۔ اس کی بیاہی زندگی کے مرقع اس طرح گذر گئے جس طرح کسی منبع سے مختلف رنگ کی روشنیاں کسی چیز پر یکے بعد دیگرے پڑیں۔ ان مرقعوں میں وہ چہرہ جو اس کے مقابل تصویر میں ہنس رہا تھا، ہمیشہ ہوتا تھا۔

وہ پہلی رات؛ وہ اس رات تو اسے چاہتا تھا؛ وہ رات جبکہ وہ تمام تحسسات قلبی کے ساتھ اس سے کانپ کانپ کر باتیں کر رہا تھا، اور وہ مارے شرم کے پریشاں ولرزاں تھی اور اس کے چہرے کو نہ دیکھتی تھی۔ اس رات بلاشبہ وہ اسے چاہتا تھا۔ ہاں صرف اسے چاہتا تھا! یہ بیچاری لڑکی، اس رات، اسے کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کے اس کی باتیں سن سن کے تہ دل سے یقین کر رہی

تھی کہ یہ منور و مسعود رات شبِ عشق ہوکر، لیلِ وصال بنکر ہمیشہ قائم رہیگی، تاابد ختم نہ ہوگی۔

اِس کے بعد مرقع کا ایک اور صفحہ پیش نظر ہوا! ایک دِن صبح کا وقت تھا وُہ سوتے سوتے یکایک جاگی: کیا دیکھتی ہے کہ وُہ خواب سے بیدار ہے، اس کے قریب بیٹھا ہی؛ اور ایک اُلفت پاش مفتونیت سے آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑے ہُوئے ہی۔ وُہ سوتے میں اس طرح دیکھے جانے سے لجائی! اور اپنی گھبراہٹ اور شرم کو چھپا نہ سکی کہ اتنے میں اُس نے اُس کے مُنہ کو جو حیرت سے کُھل گیا تھا، ایک لمبے بوسے سے بند کردیا۔ آہ یہ بوسے! لیکن اس وقت تو زندگی بوسوں ہی میں گذرتی تھی۔ اُس زمانے میں تو وُہ یہ خیال کرتی تھی کہ زندگی، ایک دائمی بوسۂ عشق ہی، یہاں تک

کہ ایک دن ان بوسوں میں، اِن بوسوں کے درمیان، اُس نے زہر کا ایک گھونٹ چکھا، کوئی سبب نہ تھا، کوئی وجہ بظاہر معلوم نہیں ہوتی تھی، کہ ایک دن اُسے اِن عشق کے بوسوں میں چھپی ہوئی ایک کھٹک محسوس ہوئی، جس نے اس کے قلب، اُس کی رُوح تک جاکر ایک ضرب لگائی۔

بس اس وقت، اُس سیکنڈ سے اُسے ایک مبہم غیر معنی ڈر نے ستانا شروع کر دیا۔ لیکن اگر یہ غیر معنی خوف، غیر معنی ہی رہتا، تو وُہ ایک پُر لطف خواب کی بے معنی گھبراہٹ پر محمول کر کے اپنے دِل کو دھوکا دے کر خوش رہتی۔ مگر یہ بھی نہ ہوا۔

ایک دِن، اتوار کا دِن تھا، وُہ گھر سے نکلتے وقت، اُس کی طرف نہ دیکھ کے یہ کہتا ہوا کہ "شاید میں آج دیر سے آؤں" جانا چاہتا تھا، اس وقت بھی اُس کی نظروں میں وُہ وقت اور موقع پھر رہا ہے، جب اُس نے پوچھا: "کیوں"؟

اور اُس کی آنکھوں سے آنکھیں ملانا چاہیں، تو اُس نے جھوٹ بولنے والوں کی مخصوص پریشانی کے ساتھ، اپنی چھتری کو لپیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا: "آج اتوار کا دن ہے شاید دوستوں کے ساتھ سیر وغیرہ میں دیر ہو جائے"
پہلا جھوٹ! اِس پہلے جھوٹ پر یقین نہ کرنے کے لئے اُس نے تمام رات کوشش کی تھی، تمام رات اپنی طبیعت کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی تھی کہ یہ عُذر جھوٹ نہ تھا: اور اس کوشش میں اس کی واپسی کے وقت تک آنکھ بھی نہیں جھپکائی تھی۔
آخر وُہ واپس آیا، اِس واپسی کے وقت، وُہ اس کی زبان سے ایک کلمۂ تسلّی، ایک حرفِ اعتذار سُننے کی اُمید رکھتی تھی
"تم اب تک سوئی نہیں"؟
"نہیں، تمہارا انتظار کر رہی تھی"۔
اِس جواب پر اگر وُہ ایک حرف ہی کہتا، ایک حرفِ محبّت!

تو اپنے اضطرابات کو وہ فوراً بھول جاتی، مگر اُس نے کچھ بھی نہ کہا. رات کے کپڑے جلد جلد پہن کے، پلنگ پر لیٹتے وقت اُس نے اُس کا بوسہ لیا تو، مگر اس بوسہ میں ایک اجتناب، ایک رکاوٹ ملی ہوئی تھی، پلنگ پر اس طرح گر پڑا گویا تھکن کے مارے اُس کا تمام جسم ٹوٹ گیا ہے، اور یہ کہہ کے: "آؤ سو رہیں" فوراً آنکھیں بند کر لیں اور سونے لگا. اس رات، رضائی میں مُنہ چھپا کے، کہ کہیں وہ سُن لے وہ رات بھر چپکے چپکے رویا کی، رویا کی.

اِس کے بعد، بات بات پر اُس کا دِل بھر آیا کرتا تھا؛ اور اس کا خاوند بھی اُسے روتا دیکھتا تھا؛ اور اُس کے رونے پر اپنی وحشت اور گھبراہٹ ظاہر کرتا تھا، اتنے اخلاق کا بھی استعمال نہ کرتا تھا، کہ اس وحشت کو چھپانے کی کوشش کرتا. کبھی بلّی کی طرح جو اپنے جسم کو آ کر اپنے مالک

سی سہلاتی ہی، لیکن ذراسی تکلیف پر پنجہ مارنے کے لئے تیار رہتی ہی، وہ اس سے کہتا: "دیکھو روٗمت، میری جان پہلے کی طرح مجھے چاہتی ہونا؟ آنکھیں پونچھ ڈالو؛ ذرا آنکھوں سے آنکھیں تو ملاؤ۔ جان! ذرا ہنس تو دو" پھر ذراسی دیر میں بلّی کی طرح، نرم پنجوں میں سے تیز ناخن نکالتا، یعنی کہتا "بس، بس رونا بہت ہوگیا؛ اس بسورنے کو بند کرو، گھر کیا ہی امام باڑہ ہی۔ تم مجھے بالکل گھر سے نکال دوگی!" یہ باتیں کب سُنتی تھی؟ جب کنوارپن، بالپن کو پیچھے چھوڑے ہوئے صرف چھ ہی مہینے ہوئے تھے۔ چھ مہینے میں اس بیچاری عورت، جوان عورت کو رونے کے لئے کس قدر کافی وقت مل گیا تھا، نہ صرف یہ، بلکہ شوہر کو اس سے سیر ہونے، اور ان کلمات کے کہنے کا بھی وقت مل گیا تھا۔

ہائے وُہ اُمیدیں! وُہ کس طرح منقطع ہوگئیں! رہا سہا رشتۂ قلب، اُس کے اِس آخری فقرہ نے "تم مجھے بالکل گھر سے نکال دوگی" توڑ دیا۔ تو گویا وُہ پہلے ہی اپنے تئیں گھر سے نکلا ہوا سمجھتا ہی، کہ یہ رونا، "بالکل" گھر سے نکال دیگا! اس کے بعد، اُس نے اُس کے سامنے طبیعت کو روکنا شروع کیا، کبھی کبھی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے، لیکن وُہ نہایت کوشش کرکے، پلکوں کو دبا کے ان آنسوؤں کو نکلنے نہ دیتی، ایک دن، وُہ اُس کے سامنے بھی طبیعت کو نہ روک سکی۔

وُہ، وُہ دن تھا، کہ اُس نے اُسے خبر دی تھی کہ وُہ اُس سب سے اعلیٰ ہدیہ کو جو عورت اپنے خاوند کو پیش کر سکتی ہے، اُٹھائے ہوئے ہی اور کچھ دِنوں میں پیش کریگی۔ اس خبر کو دیتے وقت، وُہ سمجھتی تھی کہ مارے خوشی کے

اُچھل پڑیگا، اُس کے گلے سے لپٹ جائیگا۔ مگر وُہ پتھر کی مُورت کی طرح وہیں کا وہیں رہگیا، متحیّر آنکھوں سے یوں دیکھنے لگا، گویا سمجھا نہیں۔ پھر کہنے لگا: "مگر بہت جلد"! باپ بننے کی خوشبختی کی خبر پر پہلا کلمہ جو اُسکی زبان سے نکلا وُہ یہ تھا! حالانکہ قلبًا اس کا خاوند بُرا آدمی نہ تھا، اُس کا دِل گواہی دیتا تھا، کہ وُہ بُرا آدمی نہیں ہے، سخت دِل نہیں ہے۔ پھر۔ اِس قسم کے فقرے کیُوں کہے جاتے ہیں؟ کیُوں اُسے رُلایا جاتا ہے، کیا اُن کے درمیان کوئی راز ہے، کوئی غلط فہمی ہے؟

"بہت جلد"! اس طعن پر وُہ اپنی طبیعت کو نہ روک سکی، اور رو پڑی؛ اس خیال سے معذّب ہوکر رو پڑی، کہ لو اب تک مَیں اپنے تئیں اس سے نہ چھڑوا سکی۔ لیکن اس رات، وُہ اس رونے پر غُصّہ نہ ہوُا؛ بلکہ اپنے فقرے کے اثر کو گھٹانے کی

کوشش کرتا رہا۔ میں تو مذاق کرتا تھا، تم اُسے سچ ہی سمجھ گئیں؛ کہیں مذاق سے بھی انسان اس قدر متاثر ہوا کرتا ہے، واہ واہ! علاوہ ازیں میں نے جو کہا، تمہارا ہی خیال کر کے کہا؛ ذرا سوچو تو! اگر لڑکی پیدا ہوئی، تو دس پندرہ برس کے بعد تم اور وہ دو بہنیں معلوم ہونگی" اور یہ کہہ کے، اور اس کے انگلیوں میں انگلیاں ڈال کے، اور بالوں کو چوم چوم کے، وہ گویا اُس سے معافی مانگتا تھا۔ اُس نے اُسے معاف کر دیا۔ وہ ہمیشہ ہی معاف کر دیا کرتی تھی ہمیشہ اُن شکر رنجیوں کو جو اُس غیر معنی شے، اس راز، اس غلط فہمی سے پیدا ہوا کرتی تھیں وہ معاف کر دیا کرتی تھی۔

لڑکی پیدا ہوئی؛ اور اس واقعہ نے ایک بڑی تبدیلی کر دی۔ اُس نے اپنے خاوند کو، زچگی کے پلنگ کے سرہانے روتا ہوا دیکھا یہ اپنی پچھلی حرکات پر ندامت کا رونا تھا۔

یہ پہلی دفعہ تھی کہ اُس نے خاوند کو روتے ہوئے دیکھا۔ یہ آنسو گویا اس بیچارے کے سال بھر کے اضطرابات کو دھو رہے تھے، مٹا رہے تھے۔

اس کے بعد اُس کے خیال میں اچھی گذری، یا شاید یہ ہو کہ سال بھر تک جن باتوں کی وُہ عادی نہ ہوئی تھی، اب انکی عادت پڑگئی تھی، اور اس لئے اب دوستوں کی دعوتیں؛ سیر میں بہت دیر ہوجانا، اس کی توجّہ کو اپنی طرف مائل نہ کرتے تھے، یہاں تک کہ دعوتوں، اور تاخیر سیر میں آہستہ آہستہ تواتر پیدا ہونے لگا، پھر بھی اُس کے دل میں کچھ شُبہ پیدا نہ ہوا۔

اُف! آخرکار وُہ عظیم واقعہ! جس کا خیال اُس کے آنکھوں کے سامنے، اُس کے غضبناک چہرے، اور آتش فشاں اور جگرسوز نظروں کی تصویر لا کے کھڑا کر دیتا ہی! اور یہ غضب اور یہ آتش فشانی کس لئے ہُوئی تھی؟ محض ایک چھوٹی سی

بات پر، گڑگڑائی کے لئے ایک بہانہ تھا؛ اور اُس وقت وُہ پاگلوں کی طرح ہذیان بکنے لگا تھا۔

جوان عورت، اِس واقعہ کو یاد کرتے وقت، خیال میں بھی پُورا نہیں کرتی۔ اُس کا غرورِ نسوانی، اُس واقعہ کا خیال آتے ہی، اُسے پُرقہر کر دیتا ہے، اور اِس لئے کہ وُہ مارے غصّے کے کانپنے نہ لگے، وُہ اس واقعہ کی یاد کو یُوں ہی ادھورا چھوڑ دیتی ہے۔

یہ وُہ واقعہ تھا کہ اس پر اُس نے بھی کھُلّم کھُلا اپنے خاوند سے اعلانِ جنگ کر دیا تھا اور اس کی ناسزا باتوں کا ناسزا باتوں سے جواب دیا تھا۔ یہ لڑائی برسوں رہی۔

اِس زمانہ میں، ایسے ایسے دن بھی آتے تھے، کہ وُہ کئی کئی دن تک گھر نہ آتا تھا، ایسی راتیں بھی آئی تھیں، کہ وُہ دونوں ایک بستر میں لیٹے ہوتے تھے۔ مگر دو دشمنوں کی

صفت سے لپٹے ہوتے تھے: دونوں مُنہ پھُلائے ہوئے دونوں ایک دوسرے سے مُنہ پھیرے ہوئے، دونوں میں بات چیت بند! غرضیکہ اس زمانے میں دونوں دشمن تھے، لیکن، پھر بھی نوجوان عورت اسے اچھی طرح جانتی تھی، کہ جس زمانے میں وُہ اس کی سخت دشمن تھی، اُسی زمانے میں اس کی محبّت دِل میں بیٹھی ہوئی تھی، اور اس سے بھی واقف تھی کہ گو وُہ اس زمانے میں اِس کی تحقیر کرتا تھا، اُسے ستاتا تھا، تاہم وُہ اُسے چاہتا تھا، اُس کا اسیرِ محبّت تھا.

جب کیفیت یہ تھی، تو یہ زبون زندگی کیوں؟ کیوں دونوں کسی طرح خوش خوش زندگی بسر نہ کرسکتے تھے؟ کیوں اُن میں یہ کشمکش، یہ لڑائی رہتی تھی؟ وُہ اُس سے نفرت کرنے کی کوشش کرتی، اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوتا تھا، کہ بالعکس وہ اپنے تئیں اُس کی طرف مائل پاتی تھی. اگر وُہ یہ مان لیتی، کہ یہ آدمی بُرا ہے

تو غالباً وُہ اس سے نفرت کر سکتی۔ اگر وُہ حقیقتاً بُرے دِل کا آدمی تھا، تو پھر لڑائی، ہر شکر رنجی کے بعد ندامت کے ساتھ آنا، اور اپنے ہاتھوں میں اس کا مُنہ لیکے چُومنا اور بغل کو گدگدا کے، ہنسانے کی کوشش کرنا، اور ہر طریقہ سے صلح کرنے کی ترکیبیں کرنا کیا معنی رکھتا تھا۔

اِسی بڑی لڑائی کے بعد جو اتنی مدت تک رہی، لڑکی کے چیچک نکلنے پر بھی یہ ہی ہوا تھا نا؟ بچی کے بخار اُترنے اور دانے جھڑنے پر جو گھر میں ایک بڑے اندیشہ سے نجات پانے پر خوشی پھیلی ہُوئی تھی؛ اس خوشی نے شوہر کو آخر کار اپنی بیوی کے آغوش میں گر کر معافی مانگنے پر مجبور نہ کیا تھا؟

اگر وُہ اچھّا آدمی نہ ہوتا، تو بھلا یہ ہو سکتا تھا؟ اُس کی یگانہ تسلّی اس کے شوہر کی یہ صفت تھی۔ چھ برس سے،

بُرے دنوں کو، لڑائی کے دنوں کو بُھلا دینے والی صرف یہ صفت تھی۔ وُہ کبھی یہ گمان نہ کرتی تھی، کہ ان اتفاقات کے ساتھ، اِن واقعات کے باوجود بھی بیوفائی ہوسکتی ہے: ہاں اُس نے کبھی اسے سوچا بھی نہ تھا، یا یہ کہنا چاہیئے کہ سوچنا چاہا بھی نہ تھا۔ اُسے بیوفائی سے پاک معرّا دیکھنے کی آرزو اس قدر شدید تھی کہ بیوفائی کے شُبہ دلانے والی چیزوں کو بھی خاص کوشش کرکے ذہن سے نکال دیا کرتی تھی۔

اب نوجوان عورت غور سے دیکھنے کے لئے آنکھوں کو کھول کے، دیوار پر سایہ میں لٹکی ہُوئی تصویر کو دیکھتی ہے؛ اور ایک نااُمیدی کے لہجہ میں کہتی ہے؛ "آہ! یہ اُمید بھی جھوٹی اُمید نکلی ہے۔

اُس کی پریشان آنکھیں تصویر کو دیکھ دیکھ کر اُس پر مؤاخذہ

سُوال کو "تو تو بیوفا ہی؟" کہہ رہی تھیں. کاغذ گھٹنوں پر سے فرش پر گر پڑا تھا.

بچّی نے اِس سے مطمئن ہوکر کہ گُڑیا نے خُوب اچھّی طرح سبق یاد کرلیا، اپنے ننّھے بازو پر سر رکھ کے، گویا بڑے فرض سے فارغ ہوکر، آرام سے سونا شروع کردیا. گھڑی پھر ایک بڑی گھرگھراہٹ کے ساتھ بجی ؛ دس بجے.

اب بھی نہیں آیٔگا ! مگر اب، ہاں اس دفعہ وُہ نہ آنے کا سبب جانتی تھی. راتوں کو جو بیٹھ کے گھڑیوں انتظار کیا کرتی تھی، اور دوستوں کی صحبت ہیں دیر ہوجانے کا خیال کرکے اپنے دِل کو دھوکا دیا کرتی تھی، آج کی رات اپنے دل کو اس دھوکا دینے، اِس طرح تسلّی دینے کا موقع نہیں ؛ اس جھوٹی تسلّی کو بھی ایک کاغذ کے ٹکڑے نے آکر اُس سے چھین لیا.

سڑک پر سے اِک گاڑی کے گذرنے نے گھر کی کھڑکیوں کو
ہلایا ؛ بیچاری عورت نے بڑی اُمید سے جھلملی میں سے سڑک
پر نظر ڈالی ؛ شاید اس گاڑی میں وُہ ہو مگر کوچوان نے گھوڑوں
کو قمچی ماری اور گاڑی تیزی کے ساتھ گذری چلی گئی ۔
اُس وقت عورت نااُمیدی اور عصبی غُصّے سے کانپنے
لگی ، کاغذ کو زمین سے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا ، اور سوتی
بچی کی کلائی پکڑ کر کہنا شروع کیا ؛ "نہیں آئینگے ، تمہارے
آباجان اب بھی نہیں آئینگے" لڑکی نے آنکھ کھول کر حیرت
سے اں کا مُنہ تکنا شروع کیا ، دیکھا کہ چہرہ اس قدر پریشان
ہے ، آنکھیں اس قدر جل رہی ہیں کہ وُہ ڈر گئی ؛ ادھر کلائی کے
دبنے سے ؛ اور اُس کے چھڑانے کی کوشش کرنے سے
اُس کے ہونٹ بگڑ گئے ۔ آخر اپنی ماں کی حالت ، اور کلائی
کے دبنے کی تکلیف سے دہشت زدہ ہوکر ، اُس نے رونا

شروع کردیا. اس وقت، نوجوان عورت بھی اُن آنسوؤں کو جنھیں وُہ گھنٹوں سے روکے ہُوئے تھی نہ روک سکی، اور بچّی کو گود میں لیکر اور اپنے سینے سے بھینچکر، اُس نے بھی سیلِ اشک جاری کردیا؛ اور اِس طرح ماں اور بیٹی مل مل کر، ماں سب جانتے ہُوئے، بیٹی نہ جانتے ہُوئے، اپنے شوہر، اور باپ کی غیبوبیت پر رو رہی تھیں۔

یہ پہلی رات نہ تھی کہ وُہ اکیلی تھی۔ لیکن اور راتوں کو، ایک فراغتِ نفس کے ساتھ اِس تنہائی کو کاٹ دیتی تھی؛ کیونکہ اپنے دِل کو اس خیال سے تسلّی دیا کرتی تھی، کہ باوجود چڑچڑے مزاج ہونے کے وُہ میرا مفتون، میرا والبستہ ہی، اور اب بھی آیگا تو میرا مفتون، میرا عاشق ہوکر واپس آیگا لیکن آج وُہ تسلّی کہاں؛ آج اُس تسلّی کو اِس کاغذ کے ٹکڑے نے کس بیرحمی کے ساتھ پاؤں تلے روند دیا! لڑکی کی ہچکی بندھ گئی، تو اُسے

ہوش آیا، اور اُس نے اپنی طبیعت کو یکسو کر کے، لڑکی کو
تھپکا تھپکا کے سُلانا چاہا۔ لڑکی سو گئی! اور اُس کے دماغ
میں اس کاغذ کے واقعات نے پھر آ کر جمع ہونا شروع کر دیا۔
اب ایک عزم متین کے ساتھ وُہ ایک کام کرنا چاہتی تھی! اس
خوفناک حقیقت کے کُھلنے کے بعد، فوق البشر کوشش سے وُہ
ایک علاج ڈھونڈھنا چاہتی تھی جو اس قسم کی زندگی سے جسے
بسر کرنا ممکن نہ تھا اُسے رہائی دے اور پھر اس کی پہلی پُرلطف،
پُرمحبت زندگی واپس دیدے۔ اور یہ کام اس ضعفِ نسوانی
کے ذریعہ سے کرنا چاہتی تھی جو اب تک ہمیشہ زبون! اب تک
ہمیشہ مغلوب ہی رہا تھا۔

اِس بات کا اُسے پُورا یقین تھا کہ اُس کے دِل میں اِک
مائۂ نجات ہی۔ وُہ اِسے بھی جانتی تھی، کہ کُل ماضی معہ اِس
خوفناک حقیقت کے ایک دھبّہ ہی جو دُھل سکتا ہے، محو

ہوسکتا ہے، اور بیچاری دھوکے کھائی ہوئی عورت چاہتی تھی کہ اس خوفناک واقعہ کو بھی عفو کردے، جیسا وہ اور واقعوں کو عفو کرچکی تھی، لیکن اسے بھول جانے کے لئے یہ ضرور تھا، کہ شوہر تماماً اس کا، صرف اس کا ہوجائے۔

اب لڑکی کو تھپکاتے وقت کہہ رہی تھی: "آہ! وہ عورت، تو یوں کہنا چاہیئے کہ میرا خاوند مجھ سے زیادہ اُس سے متعلق ہے۔" اس کا حوصلہ، اُسے قبول نہ کرتا تھا۔ وہ گذشتہ چھ برس کی زندگی، جو باوجود اپنی تمام مصیبتوں کے آج کی رات کے مقابلہ میں گویا پُرراحت زندگی تھی؛ اس کُل زندگی میں وہ عورت شریک تھی؛ اس زندگی کا ایک حصّہ، شاید بہتر حصّہ، یقیناً بہتر حصّہ، ایک بیسوا کے نصیب ہوا۔

وہ پیار جو اُس کے لئے ہونا چاہیئے تھا، مگر نہیں ہوا، وہ بوسے جو اُسے ملنے چاہیئے تھے، مگر نہیں ملے، وہ اُس دوسری

کو دیئے گئے! ہاں، ہاں وہ جو ایک ان ان بوسوں میں، اِن بوسوں کے درمیان، اُس نے ایک زہر کا گھونٹ چکھا تھا جو اس بیسوا کے ناپاک مُنہ کا بچا ہوا ایک قطرہ تھا! یہ خیال کرتے وقت اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا خود بھی ناپاک ہو گئی! اور خود اپنے سے اُسے نفرت ہونے لگی. اس آدمی نے، اس شوہر نے کیا کیا نہ کیا! اس کے بستر سے نکل کے اس کے بستر میں آنا، اُن ہونٹوں سے جو اُس کے مُنہ جیسے منے سے تر اور ناپاک تھے، اس کا ایک بوسہ لیکر، گویا ایک بوسہ صدقہ کر کے، اِس کا مُنہ ناپاک کرنا! اُس کی رائحہ حیات سے مست اور مدہوش ہوکر، اُس کے پاس آنا، اور اُس کے بالوں میں سر ڈال کے، مشامِ خیال سے، اُسی کو سُونگھنا اُس کے بازو پر سر رکھ کے سوتے وقت، خواب میں اُس کے ساتھ ایک ناتمام رہے ہوئے جلسہ عاشقانہ کو دیکھنا! آہ!

اس آدمی نے اس صاف و پاک نوجوان عورت کو، ایک بیسوا کا شریک بستر کر کے ملوّث کر دیا تھا!

یا اللہ! کیوں وُہ ایسا کرتا تھا؟ اگر حقیقت میں اُسے چاہتا تھا تو پھر یہ بے توجہی، یہ اغفال کیوں؟ یہ ایک خطائے موقت، ایک قضائے غفلت بھی نہ تھی۔ اِسے، اِس طرح برسوں سے دھوکا دے رہا ہے، برسوں سے یہ بیوفائی، یہ خیانت کر رہا ہے۔ اور ننھی بچی؟ اس بیسوا کے عشق پر، صرف وہی نہیں، بلکہ یہ چھوٹا ننھا، فرشتہ بھی قربان کیا جا رہا ہے۔

ننھی بچی بھی روز اپنے ابّا کے آنے کا اِنتظار کرتی ہے، اور نہ آنے کا سبب نہیں جانتی۔ وُہ پیار جو اس معصوم کا حصّہ تھا، وُہ اُسے نہیں ملتا۔ اِک معصُوم کا حق بھی غصب ہو رہا ہے۔ اس غصب پر کیوں اُس نے کمر باندھ رکھی ہے۔

نہیں ، نہیں ، یہ حالت نہ رہنا چاہئے ، نہ رہنے دیجائیگی
نہ رہیگی ۔ ایک علاج ، ایک تدبیر جو اِن تمام باتوں کو مٹا دے
اِن تمام باتوں کو ایک بُری خواب کی یاد کی طرح چھوڑ جائے ۔
آہ ! کوئی تدبیر سُوجھے ، کوئی ایسی تدبیر کہ کارگر ہو ۔
اِس کے بعد پھر اُس کے بدن سے ، یاس اور عجز کی
وجہ سے طوفانِ اختلاج اُٹھا ، اور سیلِ اشک بہانے لگا ؛
اب اُسے اِتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اپنی لڑکی پر نظر ڈالے ، رومال
میں مُنہ چھپا کے آہستہ آہستہ رونے لگی ۔
دُوسرے دِن صبح اُٹھی اور تدبیر کو سوچے ہُوئے اُٹھی
اور اس تدبیر کو عمل میں لانے کا پُورا ارادہ کئے ہُوئے اُٹھی
گو آجتک کسی باعصمت عورت نے یہ نہیں کیا مگر وُہ کریگی ،
اس خارق العادت کام کو کریگی یعنی جا کر اس بیسوا کی منت
کریگی اور اُس کا خاوند اُسے واپس دیدینے کی التجا کریگی ۔

اس کاغذ میں پتہ مفصل تحریر تھا" چوک کی بڑی سڑک میں داہنے طرف۔ حلوائی کی دوکان کی بازو سے جو گلی پھٹتی ہی، اُس میں چوتھا مکان، پیتل کے پتروں والے کواڑ کا دروازہ ......"

اس بڑی مصیبت میں اُس کے ساتھ ہمدردی کرنے والی ماما تحقیق کر آئی تھی۔

(۲)

وہ آج کی صبح ابھی پوری بیدار بھی نہ ہوئی تھی؛ آنکھوں میں رات بھر دیر تک جاگنے سے مخموری چھائی ہوئی تھی وہ خلقت جو اس زمرہ کے متوسلین میں سے ہی، اپنے اپنے گھر چلی گئی تھی؛ یا زیادہ صحیح یہ کہ ابھی گھر سے واپس نہیں آئی تھی، اس کی گرگ باراں دیدہ ماں بھی کسی کام سے باہر تھی؛ صرف ایک خدمتگارنی گھر میں موجود تھی۔

خدمتگارنی نے اوپر جا کر سونے کے کمرے کا کواڑ آدھا

کھول کے کہا: "ایک بی بی بُرقع اوڑھے آئی ہیں، اور آپ سے ملنے کے لئے اِصرار کر رہی ہیں" اس خبر پر اُسے بہت حیرت ہُوئی۔ اُس نے آہستہ سے، (کہ کہیں وُہ جو پہلو میں سو رہا تھا جاگ نہ اُٹھے) کہا: "بُرقع والی بی بی! مجھ سے ملنا چاہتی ہے؟"

اُسے یقین نہ آتا تھا، بُرقع والیاں بھی اُس سے ملنے آنے لگیں: اب تک تو کوئی برقع والی اُس کے ہاں آئی نہ تھی۔ پریشان بالوں کو جلد جلد سنوارتے ہُوئے، آنکھوں کو ملتے ہُوئے رومال سے مُنہ پُونچھتے ہُوئے، کیونکہ مُنہ دھونے کا وقت نہ تھا، ملگجے دوپٹے کو پھینک کر، ایک نیا تہ کیا ہوا دوپٹہ اوڑھتے وقت، اُس نے پھر خدمتگارنی پر ایک شبہ کی نظر، (ایک نظر جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وُہ اب تک یقین نہیں کرتی کہ حقیقتاً کوئی گھروالی

بی بی اُس کے پاس آئی ہی) ڈالی۔ کمرے میں سے پنجوں کے بل
چل کے وُہ بیٹھک کے کمرے میں، جس نے برقع والی بی بی
اب تک نہ دیکھی تھی۔ آئی۔ دیکھا، حقیقتاً ایک برقع والی بیٹھی
تھی بیٹھی تھی، غلط قلم سے نکل گیا، اس گھر میں بیٹھ کر وُہ اپنے
کو ناپاک نہ کرنا چاہتی تھی، گو محبّت اُسے اس گھر کے، گلا
گھونٹنے والی ہوا میں سانس لینے پر مجبور کر رہی تھی، تاہم پاؤں
کے سوا اور کوئی عُضو یہاں کی چیزوں کو نہ چھوئیگا۔
اُس نے اُس کی پذیرائی کے لئے، بالوں کو ذرا سنوارنے
دوپٹّے کو الّھڑپنے سے نہیں، بلکہ باقاعدہ اوڑھنے کی
ضرورت محسوس کی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کمرے میں
داخل ہوئی۔ نوجوان عورت نے جو ایک ہیکل مہیب عدالت
بنی کھڑی تھی۔ اس وقت برقع اُٹھایا؛ اور آسمان سے اُترنے
والی ایک نگاہ عصمت سے، اس بیسوا کو جس نے اُسکی زندگی

کی خوشی کو برباد کر دیا تھا دیکھا۔
یہ باوقار عورت جس کی ہر سانس ہر نظر، ہر حرکت سے باعصمت
بی بی اور ماں ہونے کی قدسی اور علوی صفت ظاہر ہو رہی تھی،
اس بیسوا کے مقابلہ میں کھڑی ہو کر اس کی زندگی کی ذلّت کو
اور بڑھا رہی تھی۔ وُہ اس سے متاثر ہو کر پُوچھنے لگی:
"آپ مجھے چاہتی تھیں، بیگم صاحب؟"
اُس نے آنکھوں سے شرارے برسا کے، بلا تردّد جواب دیا:
"ہاں تمہارے، نہیں توبہ، برسوں سے مجھ سے چھپتے
ہُوئے خاوند کے لئے آئی ہُوں" اِس آواز میں ایک عزمِ آہنیں
کی قوّت، ایک حکمِ عدالت کی مہابت موجود تھی۔ اُدھر والی فوراً
سمجھ گئی اور اپنے دل میں کہنے لگی: "اوہو، یہ اُنکی بیوی ہے؛
لیکن حسین ہے، ہرگز بُری نہیں" اب یہ دونوں عورتیں ــ
جو ہر چیز سے پہلے عورتیں تھیں ــ تیز نگاہوں سے ایک دوسرے

کا معائنہ کر رہی تھیں۔

اُدھر والی نے ایک نگاہ میں دیکھ لیا، کہ اس عورت میں جو اپنا خاوند مانگنے آئی ہے ایک حسن تھا، جو اس صنف میں نہیں نظر آتا جس سے کہ وہ خود منسوب تھی؛ ایک علوی حسن تھا جو صرف عصمت دار عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے:

ایسی آواز سے جس سے ایک ادائے استہزا ظاہر ہوتی تھی اس نے جواب دیا: "اپنے شوہر کو مجھ سے چاہتی ہو، مگر بی بی جان! آپ غلطی پر ہیں، میں نے کسی کے شوہر کو ضبط نہیں کر لیا"۔

وہ اِس جواب کی پہلے ہی متوقع تھی؛ اِس کے سنتے ہی اس نے تار باندہ دیا: "آخر اس کی کیا ضرورت ہے؟ جھوٹ بولنے کی کوئی حاجت نہیں۔ میں تم سے یہاں لڑائی لڑنے نہیں آئی ہوں۔ یقین مانو تم سے بیر رکھنے کا بھی میں اپنے میں کوئی حق نہیں دیکھتی۔ میں جو آئی ہوں تو اِس لئے کہ اب بھی شاید

تمہارے دل میں وُہ چیز باقی ہو جو ہم سب کا حصہ ہے۔ مَیں تمہیں تریاہٹ کا نہیں، تریاپریم کا واسطہ دیتی ہُوں۔ سمجھتی ہو مَیں کیا کہنا چاہتی ہوں؟ مَیں تم سے اپنا خاوند چھیننے نہیں آئی کیونکہ اپنے میں اس کی نہ قابلیت، نہ طاقت پاتی ہوں مَیں اُسے مانگنے آئی ہُوں۔ تمہاری ہتھیلی میں اس وقت ایک بہت بڑی چیز ہے، ایک گھر کا چین، ایک خاندان کا آرام تمہاری ہتھیلی میں ہے۔ اُسے چاہے مسل دو، چاہے چھوڑ دو۔ اِن آنکھوں کو جو برسوں کے رونے سے تر ہو رہی ہیں تم سکھا سکتی ہو۔ اُس سے تمہارا علاقہ کیا ہے کس طرح شروع ہُوا، اب کس رنگ میں ہے۔ مَیں اس کا کھوج نہیں لگانا چاہتی۔ یہ جانتی ہوں کہ وُہ اس وقت مجھ سے زیادہ تمہارا ہے۔ مجھ سے بھاگ کے تمہارے پاس آتا ہے۔ حالانکہ وُہ میرا شوہر ہے، اُسے صرف میرا ہو کے رہنا چاہئے۔ میرے سوا، اُس پر کسی کا حق نہیں! میرے

سوا، وہ کسی کی ملکیت نہیں، کسی کی امانت نہیں۔ تم عورت
کے دل کی باتیں شاید سمجھ سکتی ہو گی؟ سمجھتی ہو نا! ہائے کہیں
سمجھو۔ تم نے میرا شوہر لیکر مجھ سے کیا کیا لے لیا۔ گھر بھر کا امن
گھر بھر کا چین لے لیا۔ وہ کل رات اور بہت سی راتوں کی طرح
یہاں تھا، اُس نے ساری رات شاید کیا یقیناً تمہارے
ہاں گذاری، شاید تم جو مجھ سے ملنے اس کمرے میں آئیں،
تو اُن کے پہلو سے اُٹھ کے آئیں۔ لیکن جانتی ہو کہ اس کی بیوی
نے یہ رات کیونکر کاٹی، یہی رات نہیں، اسی طرح کی اور سیکڑوں
راتیں کس طرح کاٹیں۔ جہنم میں انگاروں پر لوٹ لوٹ کر کاٹیں،
میری پانچ برس کی لڑکی - ہاں سُنتی ہو، میرے پاس پانچ برس
کی ایک ننھی بھولی جان بھی ہے۔ وہ بھی رو رو کے، بابا کا انتظار
کر کے سوئی ہے۔ البتہ تمہیں خبر نہیں، کہ گھر میں یہ کیفیت
کیسی مصیبت کی کیفیت ہے اگر تم جانتی ہوتیں تو تم ضرور اُس سے

کہتیں: "جاؤ میرے پاس سے جاؤ تمہارے گھر میں جو عورت تمہارا انتظار کر رہی ہو، جو بچی تمہارا انتظار کر رہی ہو اُس کے پاس جاؤ۔ میں اُنکے بلکنے کا سبب نہیں ہونا چاہتی"...... جواب نہ دو، تمہاری آنکھوں کا نیچا ہونا ہی کافی جواب ہو۔ تم جس زندگی کاٹنے پر مجبور ہو، شاید اُس زندگی نے بھی تمہاری طبیعت کو بالکل مسخ نہ کر دیا ہوگا کیونکہ تم عورت ہو، اور عورت سے عورت پن کب جا سکتا ہو۔ ہر عورت کی طبیعت بیوی بننے، ماں بننے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ مجھے یہاں تک لانے والی، تمہاری خوشامد کرانے والی چیز، یعنی بچے کی محبت شاید تم میں بھی ہو۔"

یہ کہتے کہتے اُس پر رقت طاری ہونے لگی، اور وُہ یہ بھول گئی کہ وُہ ایک فاحشہ کے مقابلہ میں ہے، اور طبیعت پر قابو میں ذرا سی کمی آنے لگی، آواز میں باوجود بے اِنتہا

ضبط کے کچھ بھربھراہٹ پیدا ہوگئی ؛ فقرے دل میں چشمے کی طرح اُبل رہے تھے ؛ وُہ کم کہنا چاہتی تھی ، مگر زیادہ کہہ رہی تھی ۔ اُدھر والی ، اس پُرجوش ، پرخروش وَلی تقریر کے سامنے چُپ کھڑی تھی ، اور نہیں جانتی تھی کہ کیا جواب دے ؛ کبھی کبھی " لیکن میں " " مگر وُہ " سے کچھ فقرہ شروع کرنا چاہتی ؛ مگر اس بدبخت بیوی کے مقابلہ میں جو اُس کے سامنے اپنے تمام عذابِ زندگی کے ساتھ فریاد قلب کر رہی تھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی ۔

ایک دم ، یہ مغلوبیت اُس کے نفس پر گراں گذری ، اس عورت کے سامنے اپنے تئیں مقابلہ سے عاجز دیکھ کر ، اس عصمت کے حضور میں اپنی ذلتِ فحش کو بداہتاً محسوس کر کے ، اس کے دل میں ایک طغیانِ غرور اُٹھا ، اور اُس قلب میں جس میں ذرا کی ذرا کو عورت پن کی حسیات مرحمت اور رقت

پیدا ہوئی تھیں یکایک تمام حیات فاحشہ جاگ اُٹھی ۔ اور اس نے اس حس سے مغلوب ہوکر، اس عورت کو جو اس آدمی کی اتنقدر فریفتہ معلوم ہوتی تھی ۔ حقارت آمیز جواب دینے کا ارادہ کرلیا اور کہا :

سُبحان اللہ آپ کی بھی نرالی باتیں ہیں ۔ مجھ سے آکر اپنا خاوند مانگتی ہو، اگر ایسی ہی ضرورت ہے، تو اُسے پکڑ کے رکھنے ، اپنا کرکے رکھنے کی تدبیر کیوں نہیں سوچتیں"۔

نوجوان عورت نے دیکھا کہ سامنے والی اب وُہ عورت نہیں جس میں حسِ نسوانی پیدا ہو رہا تھا ، بلکہ اب وہ ایک عورت ہے جو ایک فاحشہ کی صفت سے متصف ہو کر لڑائی لڑنا چاہتی ہے ۔ اُس نے ذرا اُونچی آواز سے جواب دیا :

"مجھ سے پہلے تم نے اُسے اپنا کرلیا تھا ، اپنے ساتھ

باندھ لیا تھا؟ پھر کیوں پوری محافظت نہ کی۔ کیوں اُسے اجازت دی کہ وُہ جاکر ایک جوان لڑکی کی زندگی تباہ کردے تمہیں اُسے پکڑ کے رکھنا چاہئے تھا۔ نہ اُسے پکڑ کے رکھتی ہو، نہ چھوڑ دیتی ہو۔ مَیں اپنے میں اتنی قوت نہیں پاتی وُہ چلتر نہیں جانتی کہ اُسے تمہارے پنجوں سے چھڑالوں"۔

اُدھر والی، اب کونے میں سے ایک مونڈھا کھینچکر، اُس پر بیٹھ گئی اور پاؤں پر پاؤں رکھ کے اُنہیں ہلانا شروع کیا، اور ایک مستہزی اور بے امان نظر سے نوجوان عورت کو دیکھنے لگی۔ ایک دو منٹ تک خاموشی طاری رہی؛ دونوں سوچ رہی تھیں کہ ان باتوں کا انجام کیا ہوگا، کہ اتنے میں مونڈھے والی نے پوچھا:

"تو اب مَیں کیا کروں؟ ہر شام بیگم صاحب کے گھر، اُنکے شوہر کو ہاتھ پکڑ کے پہنچا آیا کروں"؟

اس نے اس طعنہ، اس تحقیر پر بھی صبر کیا، ایک مرتبہ پھر اس کی
نیکی طبیعت (اگر اس میں نیکی طبیعت رہ جانے کا احتمال باقی ہو)
سے اپیل کرنے کا ارادہ کیا:

"کیوں یوں مجھ پر فقرے کستی ہو میں نے شروع ہی میں
کہہ دیا تھا کہ تم سے لڑنے نہیں آئی ہوں۔ میں جو تم سے مانگتی
ہوں، جو تم سے اُمید رکھتی ہوں وُہ ایک سادی سی بات ہے
تم اُس آدمی کو چاہتی نہیں۔ یا کیسے کہوں، وُہ بھی تمہارے
لئے اور بہت سے آدمیوں کی طرح ایک آدمی ہے! وُہ بھی اِن میں
سے ایک ہے جس سے تمہارے گھر کا خرچ نکلتا ہے اور بس"۔

اس پر یکایک وُہ غصہ میں آگئی اور کہنے لگی: "میرے
گھر میں آکر مجھ کو ایسی باتیں سناتی ہو، میری ہتک کرتی ہو" اُلٹی
فاحشہ تو غصہ کے لئے ایک بہانہ ڈھونڈھ رہی تھی، "باتیں
سناتی ہو، میری ہتک کرتی ہو" پر ہی اُس نے بس نہیں کیا۔

بلکہ اَور بھی بہت کچھ کہہ ڈالا ، نوجوان عورت اب تک اپنی متانت قائم رکھے تھی لیکن اب وُہ ہاتھ سی چھوٹی جاتی تھی ، اور وُہ بھی دِلی غصّہ سے کانپ رہی تھی ، اور اُس کا دل چاہتا تھا (مگر دل کو روکتی تھی) کہ اس بیحیا عورت پر جو اپنی عادت دیرینہ کے موافق ، بغیر سوچے سمجھے اپنے سینے سے دوپٹہ ہٹائے ہوئے ، اول قول بک رہی تھی ، حملہ کر کے مونڈھے پر سے گرا دے لیکن طبیعت پر جبر کئے ہوئے خاموش کھڑی سُن رہی تھی ۔ اتنے میں دیکھا کہ خود وُہ اُٹھی اور اس سے ہاتھا پائی کرنی چاہتی ہے ، اِسکو دیکھکر اُس کا عزم صبر بالکل جاتا رہا ، اور اُس نے اُونچی آواز سے کہا :

" ہاں ہاں ، مَیں تمہیں تمہارے گھر میں ایسی باتیں سُناتی ہوں تمہاری ہتک کرتی ہوں ، جانتی ہو تم پر عصمت والی بیبیوں محبت والی ماؤں کی لعنتیں بد دُعائیں پڑتی ہیں ۔ تم جو

گھروں کے چَین، بیبیوں کے آرام کی دشمن ہو، تم جو ہمارے خاوندوں کو ہم سے چُرالیتی ہو......" یہ کہتی ہُوئی کانپ رہی ہے، اور اپنی خلل زندگی کا انتقام اس فاحشہ کی تحقیر کرنے، اُسے سخت سخت باتیں سُنانے سے لینا چاہتی ہے۔ اب اُدھر والی بھی مارے غصّہ کے پاگل سی ہو گئی: دوپٹہ بدن سے اُتار کر پھینک دیا، اور اس پر حملہ کرنے کے لئے ایک قدم آگے ڈالا، مگر صرف ایک قدم، دُوسرا قدم ڈالنا چاہتی ہی تھی کہ پیچھے سے فولادی ہاتھوں نے اُس کے کندھوں کو پکڑلیا؛ اس وقت ان دونوں عورتوں نے اُسے دیکھا۔

وُہ تھوڑی دیر سے، وہاں، کواڑ کے پیچھے کھڑا سُن رہا تھا۔ ان بیس منٹ کے زمانہ نے، اس پر تزکیۂ نفس و تصفیۂ حیات کے لئے برسوں کی ریاضت کا کام دیا۔ اوّل اُس نے اپنی نوجوان بیوی کو۔ اس بیوی کو جسکے آنسوؤں کے نشان ابتک اُس کے

رُخساروں پر تھے، جس کا صرف غمگین چہرہ کھلا ہوا تھا، باقی لمبا، متناسب الاعضاء لطیف اور شرمیلا جسم برقع میں چھپا ہوا تھا۔ دیکھا پھر فوراً نظر اُس دُوسری پر پڑی، جو بالوں کو بکھیرے، باسی مُنہ اور مخمور مگر پھٹی آنکھیں لئے، ملگجی کُرتی جو اُوپر کو چڑھ گئی تھی، پہنے اِس جسم کو ظاہر کر رہی تھی جس کے رگ رگ سے حسیات ملوث افشا ہو رہے تھے، اور جس کی تمام ہیئتِ کذائی سے گویا بُوئے فحش کے بھپکے نکل رہے تھے۔ ان دونوں کو مقابل دیکھ کر ان دونوں کا فرق اُس کی آنکھوں میں چبھ گیا۔ ایک پاک و لطیف، دُوسری کثیف و ملوث؛ ہم جسماً ہم اخلاقاً ملوث!

پھر اپنی بیوی کی آواز کی رقت میں وہ ایک ادائے استرحام پاتا تھا جو دِل کو مسلے ڈالتی تھی! اُس دُوسری کی آواز میں بے انصافی، استہزا، گستاخی، جرأت چھپی ہوئی تھی جسکو

سن کے وجدان نفرت کرتا تھا ۔ اور اُسے ایسا جوش آیا،
کہ اُسے تھپیڑ مار کے گرا دے ، اور اس کے قدموں پر گر پڑے۔
اللہ کی پناہ ! اِس عورت ، اِس مقدس اور محترم فرشتۂ سعادت
کو کس پر قربان کر رہا تھا ، کس کے لئے ستا رہا تھا ؟ ایک فرسودہ
ملوث مخلوق کے لئے جو سیکڑوں آغوشوں میں جاکر ، متاعِ
عشق اور جنسِ حسن بیچتی تھی ۔

ایک منٹ میں وُہ آنسوؤں کے دریا جو اُس کی وجہ سے
بہے اُس کی نظروں کے سامنے سے گذر گئے ۔ وُہ تمام
بے انصافیاں جو اُس نے اپنی بیاہتا کے ساتھ کی تھیں ،
اس کی ضمیر پر برچھی کی طرح آ کر لگیں ۔ اب قلباً اپنے تئیں
اِس سے کس قدر مربوط ، اور اُس سے کس قدر دور پا رہا ہے!
جب یہ بات ہے ، تو اب تک کونسی چیز مانع ہے ؟ بس انشاءاللہ
ایک پھلانگ میں اپنے تئیں اس قعرِ مذلت سے نکال کر، اپنی

زندگی اپنی بیوی بچوں کے لئے وقف کردیگا، اور اُس کے پاؤں پر سر رکھدے گا.

یہ سوچ ہی رہا تھا، کہ دیکھا کہ فاحشہ اس کی بیوی پر ہاتھ چھوڑنا چاہتی ہے. یہ دیکھتے ہی دُنیا، اُس کی آنکھوں میں تاریک ہوگئی؛ وہ بجلی کی تیزی کے ساتھ کواڑ کھول کے کمرے میں در آیا، اور اپنے آہنیں پنجوں سے اُس کے کندھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا اور پھر ایک ذرا سا جھٹکا دے کے اُسے اور اُس کے ساتھ اُس کی محبت کو اپنے سے دُور پھینک دیا؛ اور پھر اپنی بیوی کے پاس جاکر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے. اور ایک نگاہ استرحام کے ساتھ جس میں آج کے دِن تک کی تمام قصوروں کے لئے طلبِ عفو آکر جمع ہو گئی تھی، اُس نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا:

"میری خطاؤں کو معاف کردو، مَیں صِرف تمہیں چاہتا ہوں!

مَیں صرف تمہارا ہُوں اور تمہارا ہو کے رہونگا"۔

اور پھر اُس کے چہرے کو جس پر دو آنسوؤں کے قطرے دو قطرۂ سعادت۔ ڈھلک رہے تھے، اپنی طرف کھینچ کے، اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھدیتے،

اور جبکہ وُہ فاحشہ اپنے غصہ اور حسد کو ایک کھسیانی ہنسی سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی؛ اس بیاہے جوڑے نے جن کے درمیان اب تک ایک سرد مہری کی دیوار حائل تھی جسے وُہ ہٹا نہ سکتے تھے۔ پاک، صاف، محبت بھرا بوسہ لیکر گویا دوسری مرتبہ نکاح کیا؛ اور وُہ پیمانِ وفا باندھا جو اب عُمر بھر تک نہ ٹوٹیگا یہ بوسہ اس پیمانِ وفا کی مُہر تھا۔

حکایۂ لیلےٰ و مجنوں

(۱)

قیس کمرے میں نہایت غمگین حالت میں بیٹھا تھا، میز پر سے ایک کاغذ کو اُٹھاتا تھا، اُسے پڑھتا تھا، پھر رکھدیتا تھا، پڑھتا تھا، ٹھنڈا سانس بھرتا تھا، پھر رکھدیتا تھا.

یہ لیلےٰ کا مارکونیگرام[1] تھا، جو ابھی ابھی اُسے ملا تھا: "میں کل موٹر کار پر سیر و سیاحت کی غرض سے ایک ہفتہ کے لئے جاؤنگی، ڈاکٹروں کی رائے ہی کہ جنگل کی خُشک ہوا، میری صحت کے لئے مفید ہو گی. خدا حافظ، تمہاری لیلیٰ."

[1] بغیر تار کی تار برقی۔

بات یہ تھی کہ قدرت نے - اس ستم ظریف، مرحمت ناشناس
قدرت نے جو ہم سب کو اپنا بازیچہ بنائے ہوئے ہی - بیچارے
قیس عامر کو پھر نجد میں لا بٹھایا تھا؛ مگر کس نجد میں؟ اُس نجد میں نہیں
جو قیس - بھولے، سچے قیس کے زمانہ سے لیکر ۱۹۰۰ء تک
تھا، اُس نجد میں نہیں جس میں آجتک قیس کی رُوح شاداں و فرحاں
پھرتی ہی، کیونکہ وُہ اب تک نجد' میں اپنے زمانے کے صحرا، اپنے
زمانے کے ٹیلے، اپنے زمانے کے غزال، اپنے زمانے کی
صبا، اپنے زمانے کا ناقہ، اپنے زمانے کے ساربان پاتی
ہے؛ بلکہ اُس نجد میں جس میں اب ریل تھی، تار تھا، موٹر کار
تھی، ٹراموے تھی؛ ترقیاں تھیں، مصیبتیں تھیں۔
اِس نجد میں - اس تبدیل شدہ جولانگاہِ وحشت میں جس میں
اُس نے اپنے عشق اور جنون یا بہ الفاظِ دیگر عشق یعنی جنون،
یا جنون یعنی عشق کے دِن کس آزادی سے کاٹے تھے؛ اب وُہ

پیدا ہوا تھا، اور وہ ہی اکیلا پیدا نہیں ہوا تھا، قضا و قدر کو اپنا مذاق پورا کرنا تھا، اِس لئے عین اس زمانہ میں لیلیٰ بھی پیدا ہوئی تھی جن صحراؤں میں وہ غزالوں کو پکڑ پکڑ کے انکی آنکھیں چوما کرتا تھا، کیونکہ وہ لیلیٰ کی آنکھوں سے مشابہ تھیں، اُن صحراؤں میں اب وہ عفریت جو آگ کھاتا ہوا اور دھواں اُگلتا ہی، پھنکاریں مارتا ہوا اور بل کھاتا ہوا، رات دن پھرتا تھا، اور ان بھولے لیلیٰ صفت غزالوں کو پریشان کئے ہوئے تھا، اور اب وہ مجنوں کے پاس آنا کیسا، اِنسان کی صورت سے بھڑکتے تھے اور اسکی کلفت بار ترقیوں کی نشانیوں سے بھاگتے پھرتے تھے.

قیس کو قضا و قدر کی طرف سے کبھی کبھی یہ علم ملجاتا تھا کہ وہ وہی پُرانا قیس ہی، اور اُس وقت وہ اس زمانہ کو یاد کرتا تھا کہ ناقے کے پیچھے دوڑا دوڑا جارہا ہے۔ محمل میں لیلیٰ ہی نہیں بھی ہی تو بھی یہ خیال اس کے دل کو خوش کر رہا ہے کہ شاید اُس کے اندر

لیلیٰ ہی. یا اب ؟ اب لیلیٰ کا یہ تار ہے کہ اس کی خرمن صبر پر بجلی گرا رہا ہے ."لیجئے، اچھا بہانہ کر کے چلدیں . جانتیں ہیں، کہ مَیں تعاقب نہیں کرسکتا ، یا اللہ ! تو نے حسینوں کو ظالم بنایا تھا ، تو عاشقوں کے ستانے کے لئے نئی ، نئی ایجادیں تو نہ کرائی ہوتیں ، مجھ خستہ جان کے لئے تیز رفتار ناقہ ہی کیا کم تھا ، کہ اب تو نے موٹر کار ایجاد کرا دیا . صبح وُہ چلدینگی ، اور مَیں ، مَیں اِس شہر میں پڑا سڑا کرونگا ، او ستم ایجاد لیلیٰ ! او عاشق کُش لیلیٰ ، ریل میں بھی تو بیٹھ کے نہیں گئی کہ مَیں اُسی ٹرین میں بیٹھ جاتا ،، یہ کہا اور پھر ہاتھوں میں اپنا مُنہ چھپا کے سوچنے لگا .

تھوڑی دیر بعد ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا ، اور میز پر جا کے نوکر کو بُلانے کے لئے برقی گھنٹی بجائی ، دس سیکنڈ گذرے ہونگے کہ دُوسری مرتبہ اَور زور سے گھنٹی بجائی .

نوکر بڑبڑاتا ہوا : "خُدا خیر کرے : اب تو وقت بیوقت

گھنٹیاں بجاتے ہیں، یہ آدھی رات، سب سو رہے ہیں، دن
بھر تو یُوں ہی مجھے ناچ نچاتے رہے، رات کو ذرا کی ذرا آنکھ
لگی تھی، کہ لیجئے پھر یہ گھنٹیوں کا تار بندھ گیا۔ مَیں باز آیا، اس
نوکری سے، اگر ایک ہفتہ اَور رہا تو مَیں بیمار پڑ جاؤنگا۔ سُبحان اللہ
اچھا عشق ہے کہ نہ خود چین لیتے ہیں نہ کسی کو چین لینے دیتے ہیں"
کمرے میں داخل ہوا اور کہا: "حضور کیا ارشاد ہے"؟
"ارشاد کیا ہے۔ گھنٹیاں بجاتا بجاتا عاجز ہو گیا، تم سُنتے
ہی نہیں، کان میں روئی ٹھونس لی ہے یا کیا"؟
"خُداوند غلام قصُور دار ہے، مگر حضور ہی دیکھیں یہ گھڑی
لگی ہوئی ہے؛ ایک بج کے بیس منٹ آئے ہیں؛ اُسوقت میں نے
ہزار چاہا کہ آنکھ کُھلی رکھوں مگر جھپک ہی گئی"۔
اچھا، بہت باتیں نہ بناؤ، حاجی جاسم واخوانہ کی دوکان
پہ جاؤ میری طرف سے بہت بہت سلام کہنا اور کہنا کہ ۲۵

گھوڑوں کی طاقت والی موٹر کار، ایک ہفتہ کے لئے کرایہ پر
چاہتا ہوں، ذرا سیر کے لئے جانا ہے۔ فی الحال تو کرایہ میرے
پاس نہیں، واپسی پر انشاءاللہ اُن کا کرایہ فوراً ادا کردونگا"۔
"حضور! اسوقت دکان کہاں، حاجی جاسم کبھی کے گھر
میں جاکر سورہے ہونگے"۔
"حاجی جاسم نہیں تو قنبر علی احمد و شرکاہم کے ہاں جاؤ"
"حضور، ناراض نہ ہوں؛ یہ اس قسم کی دُکانوں کے کھلے
رہنے کا وقت نہیں ہے، شاید حلوائیوں کی دکانیں اور ایک آدھ
قہوہ خانے اسوقت کھلے ہوں، ورنہ ساری دُنیا سورہی ہے"۔
"جا نالائق، دُور ہوجا، مجھے جواب دیتا ہے، عقل سکھاتا
ہے بے ادب کہیں کا"
نوکر خلاصی پانے کی ترکیب سوچ ہی رہا تھا، اس ناراضی سے
دل میں نہایت خوش ہوا، چپکے سے باہر آگیا، اور اپنی جگہ پر

جا کر بیٹھ گیا ۔

تھوڑی دیر تو قیس کل نوکروں کی جنس پر اُنکی بیخ و بُنیاد پر لعنت بھیجتے رہے " ایک بھی نوکر ڈھنگ سرے کا نہیں ملتا، جس کام کو کہو، ہین میخ نکالینگے، جو حکم دو، اُس سے بچنے کے لئے بہانہ ڈھونڈھ لینگے " پھر کچھ غُصّہ فرو ہوا تو خود خیال آیا " نہیں تو" بلال کا کہنا، ٹھیک تھا، اس وقت بھلا کون دُکان کھُلی ہوگی؛ اور کھُلی بھی ہوئی تو کیا فائدہ ۔ والد کی سختی کے طفیل میں کوئی دُکاندار قرض دیتا نہیں، اور اگر مَیں خود اُن سے یہ خواہش کروں کہ موٹر کار خرید دیجئے تو وُہ کیا اس خواہش کو پُوری کرنے کے روادار ہونگے، ہرگز نہیں، کس مشکل سے تو اُنھوں نے بائسکل خرید کے دی تھی ۔ اب کس مُنہ سے موٹر کار کی فرمائش کروں ۔ لیکن ہائے میری قسمت ! مَیں نے بائسکل خریدی تو لیلیٰ نے موٹر کار پر توجہ کی ۔ مَیں کسی طرح بھی اُس کا مقابلہ نہیں

کرسکتا، وہ اتنے بڑے گھرانے کی، ایسے نازوں کی پلی کہ جس کے ایک اشارے پر سینکڑوں مامائیں، خادمائیں دَوڑی آتی ہیں، بھلا مجھے کب خاطر میں لاسکتی ہے، یہاں نصیب میں ایک بلال ہے وُہ بھی بڈھا ہُست . یہ بھی ہم مکتبی کے حقوق کا خیال ہے، جو وُہ مجھ قسمت کے مارے پر اتنی توجہ، توجہ کیسی، اتنی عنایت، میں عنایت کا کب سے مستحق ہوگیا اِتنا رحم کرتی ہے، کہ کبھی کبھی ایک نگاہِ غلط انداز سے مجھے دیکھ لیتی ہے . آہ لیلا ! میں تیرا شکریہ ادا نہیں کرسکتا ؛ تو نے مجھے تار بھیج کے اپنے ارادے سے اِطّلاع تو دی ؛ اگر بغیر اطّلاع دیئے ہی چلی جاتی تو مَیں کیا کرلیتا موٹر کار کی آرزو ! ہُشت ! مَیں بھی کیسا بیوقوف ہوں، آج وُہ موٹر کار پر سوار ہوکر جاتی ہے تو مَیں موٹر کار کے لئے مر رہا ہوں اچھا اگر کہیں کسی ضرورت سے اُس نے کل اسپیشل ٹرین چھڑا دی تو مَیں اسپیشل ٹرین کہاں سے لاؤنگا . کیوں جناب

قیس صاحب! اب آپ سمجھے، آپ زیادہ ریس نہ کیجیے۔ اپنا قدرِ خود بشناس"۔

اِس طرح قیس اپنے دل کو سمجھاتا تھا؛ تھوڑی دیر تو وہ ساکن بیٹھا، لیکن پھر بیٹھا نہ گیا۔ آدھی رات، گھر بھر میں سناٹا (قیس کے والد نے ایک مختصر سا گھر۔ اپنے گھر سے ملا ہوا قیس کو دے رکھا تھا) مگر قیس کوٹھے سے اُتر کے نیچے آیا، اور ایک کمرے میں جو کباڑ خانہ تھا، جا کر چیزوں کو اُلٹ پُلٹ کرنے لگا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی محنت کے بعد، اپنی بائسکل کو تیل وغیرہ ڈال کے درست کیا، اور نہایت بیتابی سے صبح کا انتظار کرنے لگا۔ پو پھٹی، اور قیس بائسکل پر سوار گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

(۳)

قیس بائسکل پر سوار گھر سے نکل کھڑا تو ہوا، لیکن شہر سے باہر

پہنچتے ہی سوچنے لگا "کدھر جاؤں" مختلف سڑکیں مختلف سمتوں کو جارہی تھیں۔ کدھر جانا چاہیئے؟ یہ ظاہر ہے کہ اُدھر جانا چاہیئے جدھر لیلیٰ گئی ہو، مگر خود لیلیٰ کس طرف گئی ہے؟ اس کا کس طریقہ سے پتہ لگایئے، لیلیٰ کے گھر جاکر دریافت کرے؟ مگر وہاں تو اس کی پذیرائی خاص طور پر ممنوع ہے۔ یہی تعجب ہو کہ وہ کس طرح تار بھیج سکی، پرسوں ہی تو وہ خط جو اُس نے، اُس کے نام بھیجا تھا واپس آگیا تھا، اور اُس پر لیلیٰ کے والد کے ہات کا یہ لکھا ہوا تھا: "قیس کو معلوم ہو کہ باوجود منع کرنے کے، خط بھیجے جانا، اُس کے حق میں مفید نہیں ہوگا، وہ متنبہ کیا جاتا ہو کہ اس قسم کی بے سُود اور غیر شریفانہ کوششوں سے باز آئے"۔ باوجودیکہ اُس نے لفافے پر اپنا نام نہیں لکھا تھا، نہ اندر اپنا نام لکھا تھا، لیکن لیلےٰ کا باپ؟ اور اُس کا خاندان نہایت ہوشیار تھا؛ اور اس کا خط پہچان لیا جاتا تھا۔ آہ! اس خط

کے پکڑے جانے پر، معلوم بیچاری لیلیٰ پر کیا کیا ستم نہ ڈھائے گئے ہونگے. مگر واہ ری عاشق نواز لیلیٰ! تو نے پھر بھی جادہ وفا سے قدم نہ ہٹایا، اور نہ معلوم کن خطروں میں پڑکر، اور خدا ہی جانتا ہے کہ کن مصیبتوں کا سامنا کرکے وہ تار بھیجا. لیکن جہاں اتنی عنایت کی تھی کہ اپنی روانگی سے اطلاع دی تھی، وہاں سمت سفر سے بھی اگر مطلع کر دیتی، تو بندہ احسان اور احسانمند ہوتا، ہاں مگر وہ تو خود نہیں چاہتی کہ میں تعاقب کروں، کیونکہ اس تعاقب کا نتیجہ میرے لئے اور اُس کے لئے بھی اچھا نہیں. کچھ ہو، اگر مجھ سے تو اب گھر میں بیٹھا نہیں جاتا، میں جاؤنگا ضرور، چاہے اُس سے کوسوں دُور رہوں، تاہم پھر وہی سوال ہی، جاؤں کس طرف کو؟" اس کشمکش میں اس بیقراری میں، کبھی اِس طرف کو دیکھتا تھا، کبھی اُس طرف کو، کہ بادِ صبا - جو زمانِ سابق میں لیلیٰ کی زلف عنبریں سے شمیم جانفزا لایا کرتی تھی - اپنے ایک جھونکے میں مٹی کے

تیل کی بُو لائی۔ قیس مارے خوشی کے اُچھل پڑا۔ "آہا پتہ لگ گیا، اِسی طرف سے گئی ہیں، پٹرول کی بُو صاف کہے دیتی ہی۔ اب ایک منٹ ٹھہرنے کا وقت نہیں ہی" اور یہ کہہ کے اپنی پُوری طاقت سے بائسکل چلانی شروع کردی۔

مگر جس طرح پیادہ پا قیس، ناقہ سوار، محمل نشین لیلی کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا اِسی طرح بائسکل سوار قیس، موٹر کار سوار لیلی کی گرد تک کو نہ پہنچ سکا۔

لیکن تھکن کیا شے ہی، نااُمّیدی کیا چیز ہے، اُسے نہ جاننے والے قیس کے لئے یہ کوئی ہمّت بٹھا دینے والی بات نہ تھی۔ وُہ برابر جارہا تھا۔

موانع کی وُہ پروا نہ کرتا تھا؛ ایک جگہ راستہ درست کیا جارہا تھا، سڑک پر پتھروں کے ڈھیر لگے ہُوئے تھے، پتھر کوٹنے کا انجن، اپنی بھاری بھرکم چال سے، اِدھر سے اُدھر

اُدھر سے اِدھر پھر پھر کر، آہستہ خرام بلکہ مخرام۔ زیر قدمت ہزار سنگ است کی تفسیر کر رہا تھا۔ "راستہ تعمیر کے لیئے بند" کا تختہ لگا ہوا تھا مگر قیس پگڈنڈی ہی پر سے اپنی بائسکل لے گیا۔ تھوڑی دُور گیا ہوگا، کہ بائسکل کی گھنٹی بگڑ گئی، اُس کو پریشانی تھی کہ بغیر گھنٹی کے کس طرح گذر ہوگا۔ سڑک پر چھکڑے، اُونٹ، گائے، بھینس قطار در قطار ملتے تھے، اگر گھنٹی یا بلوا ہارن[۱] نہ ہوا تو بائسکل چلانا قطعاً غیر ممکن ہوگا، کہ اتنے میں ایک گاؤں والا نظر پڑا جو ٹوکرے میں چند بطخوں کو رکھے لئے جا رہا تھا۔ بطخوں کی "قیں، قاں" سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ دیوانہ بکارِ خویش ہُشیار۔ قیس کو فوراً ایک ترکیب سُوجھی! گانوں والے کو آواز دیکر ٹھہرالیا اور اُس سے بطخوں کا ٹوکرا خرید کر، ہینڈل پر باندھ لیا۔

"قیں قاں، قیں قاں، قیں، قیں قیں" راستہ میلوں تک صاف تھا!

---

[۱] بگل کی صورت کی چیز جو بائسکل پر لگی ہوتی ہے اور جسے دبا کر بائسکل سوار لوگوں کو متنبہ کرتے ہیں ۱۲

سڑک چکر کھاتی ہوئی دُور تک جارہی تھی ! صبح کا ، نجد کی صبح کا ، (لندن یا کلکتے کی گلا گھونٹنے والی صبح کا نہیں) سُہانا وقت تھا ! اور ریگستان کی خشک اور ٹھنڈی ہُوا ۔ وُہ ہُوا ، جو اپنی صفائی کے لحاظ سے ان مرطوب بادلوں والی ممالک معتدلہ و بارِدہ کے ہُواؤں پر ہنستی ہی؛ وُہ ہُوا جو عاشق مزاج ، شاعر طبیعت ، رِن دوست ، موت سے نڈر آدمی ، اور شرف بخش حیوانیت یعنی اصیل اور شریف گھوڑے پالتی ہی ؛ وُہ ہُوا جو راجپوتانہ میں راجپوت جیسی غیور ، اور حجاز اور نجد میں عرب جیسی شجیع قوم پیدا کرتی ہے ۔ سائیں ، سائیں چل رہی تھی ۔ نسیم صبح ، قیس کے پُرانے دوست ببولوں کو (جو سڑک کے دونوں طرف لگے ہُوئے تھے) ہلا رہی تھی ، ببول راستہ میں ، قیس کے شرف میں ، اپنے پُرانے دوست قیس کے اعزاز میں پھُول بچھا رہے تھے ۔ قیس کی بائسکل اس زور سے جارہی تھی ، پہیئے اس تیزی سے چکر کھا رہے تھے کہ پہیوں کی

تیلیاں نظر نہ آتی تھیں، بلکہ ایک مسطح دائرہ گھومتا نظر آتا تھا۔

سڑک پر سنّاٹا تھا، بس کہیں کہیں بیچ سڑک میں گلہری اپنے اگلے پنجوں میں کوئی بیج لیے کُترتی نظر آتی تھی، لیکن اس بائسکل سوار عاشق کو دیکھ کر "چک" "چک" گویا "جایئے جایئے اپنے محبوب کی تلاش میں جایئے مگر مجھے تو نہ ستایئے" کہتی ہُوئی، ببول کے درختوں پر چڑھ جاتی تھی۔ یہ جاں بخش ہوا، یہ سماں قیس کو بھی متاثّر کیے بغیر نہ رہا۔

سواری کی ریاضت سے خون رگوں میں تیزی کے ساتھ دَوڑ رہا تھا، چہرے پر سُرخی تھی اور دل بے اختیار کچھ گانے کو چاہ رہا تھا؛ تھوڑی دیر تک تو قیس، سیٹی بجا بجا کے، دل کی خواہش پوری کرتے رہے، پھر یکایک پوری آواز سے الاپنے لگے، ؎

دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید　　یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

کہ دہررر فٹ۔

قیس کے قدیمی دشمن نے اپنا کام کیا: خارِ مُغیلاں نے بائسکل کے ربڑ میں سُوراخ کر دیا، اور اس طرح اپنے پُرانے فرض کو بہ احسن طریق انجام دیا۔

قیس کے تلوے نہ ملنے پر، یہ اُس کا انتقام تھا۔ قیس کی کُہنی اکھڑ گئی تھی، اور بائسکل ٹوٹ گئی تھی۔

(۳)

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس   آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

یہ شعر تو نہیں، مگر اس شعر کے ہم معنی خیالات کا ہجوم قیس کے دل و دماغ پر ہو رہا تھا، کیونکہ یہی مُصیبت کیا کم تھی کہ لیلیٰ کی محبت اُسے چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھی، اُس پر مُصیبت مزید یہ کہ کبھی کبھی اُسے اِس کا علم ہو جاتا تھا، کہ وُہ اپنی پچھلی زندگی کی تکرار کر رہا ہے، اُس پُرانے زمانے کو نئی شکل میں دُہرا رہا ہے۔

اُسکے آئینۂ قلب پر، ہزار برس قبل کے نجد، اور اس قدیم نجد میں، اس کی قدیم زندگی کا اِنعکاس ہوتا تھا؛ یہی نہیں ہر مشرقی مُلک کے لٹریچر میں، فسانوں میں، نظم میں، نثر میں وُہ اپنے تئیں جلوہ گر پاتا تھا، کہیں اس کے ساتھ اِستہزا کیا جاتا تھا، کہیں ہمدردی ظاہر کی جاتی تھی، کہیں اُسے جھوٹا قرار دیا جاتا تھا، کہیں کچھ، کہیں کچھ. وُہ ان سب کو پڑھتا تھا، اور خون کے گھونٹ پی پی کر رہ جاتا تھا.

یُوں تو اکثر اس کے دل پر چوٹ لگانے کے لئے کوئی نہ کوئی چیز موجُود ہو جاتی تھی، لیکن آج ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کل دُنیا نے اُسے ستانے کی سازش کر لی تھی.

دہلی کے سول ملٹری ہوٹل میں بیٹھا ہُوا تھا؛ بہار کا موسم تھا یعنی جاڑا جا چکا تھا، اور ابھی گرمی کی گرما گرمی شروع نہ ہُوئی

تھی۔ یہ موسم ہندوستان کی سیر کے لئے بہت مناسب ہے۔
قیس اس سے اچھی طرح واقف تھا، کیونکہ اس سے قبل کئی مرتبہ
اپنی خواہش سے، اقربا کے اصرار سے، ڈاکٹروں کی رائے
سے وُہ ہندوستان اور دُوسرے ملکوں کی سیاحت کر چکا تھا
اس دفعہ وُہ ڈاکٹروں کے حکم سے۔ جنہوں نے اس کی بائسکل
کی چوٹ کی وجہ سے لیلیٰ کے تعاقب نہ کر سکنے سے جو مزاج
میں حد درجہ کی وحشت پیدا ہو گئی تھی، اس کے علاج کے
لئے سفرِ ہندوستان تجویز کیا تھا۔ وُہ یہاں آیا ہوا تھا۔
یہ موسم دُنیا بھر میں دلکش ہوتا ہے، ہر جگہ زینت بخشِ عالم
ہوتا ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان۔ خُدا کے دیئے
ہُوئے رُوح پرور مناظر، اُس کی عطا کردہ پُرتنعّم نباتات و جمادات
کی نعمتوں کے علاوہ ہر خوبی کو اپنے ہاتھوں کھو دینے والے
والے ہندوستان۔ میں نیچر کے چہرہ پر غازۂ حُسن نہ پھیر دے۔

تیسرا پہر تھا، قیس ہوٹل میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے بیٹھا ہُوا، اخباروں کو پڑھ رہا تھا، اور تھوڑی تھوڑی دیر میں اخباروں کو میز پر رکھ کر، سڑک پر آنے جانے والوں کی سیر کر رہا تھا۔ پائنیر کو پڑھ چکا، تو اُس نے پیسہ اخبار اُٹھایا اور پڑھنا شروع کیا:

"ہم اس کے کہنے میں ذرا سا بھی تامّل نہیں کرتے کہ...... صاحب کا زمانہ اپنے پیشرو کے زمانہ سے انشاءاللہ بہتر ہوگا۔ وہ پچھلی غلطیاں، وہ ہماری قوم کو تہ و بالا کر دینے والی غلطیاں وُہ شاید، ہمیں اُمید کرنا چاہیئے کہ یقیناً اُنکے زمانہ میں سرزد نہ ہونگی۔ قوم کی سرداری آسان کام نہیں، لیکن اِس مشکل کام کو...... صاحب انشاءاللہ اچھّی طرح انجام دینگے۔

دَورِ مجنوں گذشت و نوبتِ ماست

ہر کسے پنج روز نوبتِ اوست"

قیس آگے نہ پڑھ سکا؛ اِس شعر نے اُس کے قلب، اُس کے

جگر گاہ تک جاکر، اس کے حسیات خفتہ کو جو اس سفر میں اُسے اِس قدر نہ ستا رہے تھے پھر جگا دیا۔ یہ عُمر میں پہلی دفعہ تھی کہ اُس نے یہ شعر پڑھا ہو، لیکن اُس پر اِن دو مصرعوں کا اثر کچھ اَور ہی ہوا، کیونکہ آج اُسے پھر یہ علم ہوا تھا کہ وُہ وُہی پُرانا قیس ہے۔ اور اُس نے کہنا شروع کیا: "کہتا ہے ہر کسے پنج روز نوبتِ اوست، یہ نہیں سمجھتا کہ جس مجنوں کے زمانہ کو وُہ ختم سمجھتا ہے، وُہ بدنصیب اپنی زندگی، اپنی مصیبت بھری زندگی پھر کاٹنے پر مجبُور کیا جا رہا ہے، اور اس دفعہ کسی کو یقین بھی نہیں آتا کہ یہ وُہی پُرانا قیس ہے۔ اِس لئے کوئی اس سے ہمدردی نہیں، کوئی اس کے حالات پر توجہ نہیں کرتا۔ ہر کسے پنج روز نوبتِ اوست! بجا ہے۔ مَیں تو جس کی نوبت ختم ہو گئی تھی سینکڑوں برس کے بعد، پھر اُسی سلسلۂ زُلف کا اسیر، انہی بیڑیوں کا قیدی کر دیا گیا"۔

قیس کے دماغ میں یہ خیالات گذر رہے تھے کہ اُس کے کان میں ایک آواز ایک پتلی آواز جو صاف بتا رہی تھی کہ یا لڑکے کی ہے یا کسی عورت کی، پہنچی؛ اور اُس نے سڑک پر نظر ڈالی۔ دیکھا کہ ایک تیرہ چودہ برس کا لڑکا، معمولی نوکروں کے کپڑے پہنے، ایک ہاتھ سے گیند اُچھال اُچھال کر دوسرے ہاتھ میں لیتے ہوئے، اپنے آقا کے کسی کام پر یا کوئی پیغام، یا پیغام کا جواب لئے جا رہا ہے اور نہایت مزے کے سُروں میں گا رہا ہے:

داستاں میری سُنو قصّۂ مجنوں نہ سُنو
وُہ بھی کیا قصّہ کہ جس کی کوئی بُنیاد نہ ہو

قیس ایک دم، پاؤں زمین پر مار کے اُٹھ کھڑا ہوا، اور کمرے میں ٹہلنے لگا اور اپنے دل سے نہایت غصّہ میں باتیں کرنے لگا: "اور لیجئے، وُہ بھی کیا قصّہ کہ جس کی کوئی بُنیاد نہ ہو، تو

یہ کرب مفارقت، یہ صحرا نوردیاں، یہ آہیں، یہ نالے جو ہیں نے وہاں کئے یہ سب فرضی ہی تھے، گویا میرے پاؤں میں چھالے پڑے ہی نہیں، گویا ان چھالوں کو کبھی کسی کانٹے نے پھوڑا ہی نہیں۔ ہاں، ہاں یہ سب فسانہ، اور یہ صاحبزادے، ان کا قصہ صحیح۔ بیشک آپ کا قصہ صحیح۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ بیشک صحیح ہے کہ کل آپ کی پتنگ کٹ گئی تھی، اور اس کے ساتھ آپ کے مانجھے کی ڈور وہ بہت سی چلی گئی، جس کا آپ کو بہت قلق ہے۔ بیشک صحیح ہے کہ کل گولیاں کھیلنے میں آپ ہار گئے، اور آپ کے رفیق سے آپ کی خوب لڑائی ہوئی اور اس نے آپ کو دھمکایا جس سے آپ آدھ گھنٹہ رویا کئے۔ اور جب اپنے آقا کے پاس آئے تو اس نے بھی آپ کی غیر حاضری پر آپ کو خوب سا مارا۔ بیشک آپ کا قصہ ترحم انگیز ہے، اور میری کہانی مہمل اور بے معنی ہے۔ کسی کے سننے کے لائق نہیں:

سننے کے لائق کب ہو، بے اصل ہی بے بنیاد ہے۔ نہیں نہیں، تم تو بے سمجھے الاپ رہے ہو، اصل مصنّف صاحب کی خدمت میں عرض کرنی چاہئے کہ بیشک آپ نے جو فرمایا درست ہے، کوئی شک نہیں کہ آپ کا قصّہ صحیح کہ گھر میں کل رات سالن ذرا سا جل گیا تھا، وہ آپ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے سارا کھانا زمین پر پھینکدیا، اور اپنی بیوی کی اچھی طرح خبر لی، وہ بیچاری سسک سسک کے روتی رہی، آپ اپنی جیب میں پرچۂ غزل ڈال کر، مشاعرہ میں تشریف لائے، اور نہایت فخر سے غزل پڑھی، چاروں طرف سے واہ واہ کے طوفانِ شور افزا میں آپ اور آپ کی غزل غرق ہو گئی۔

اس شعر پر آپ نے خاص طور پر داد طلب کی اور آپ کو حسب الامر، حسب الطلب خاص طور پر داد ملی:

داستاں میری سنو قصّۂ مجنوں نہ سنو　　وہ بھی کیا قصہ کہ جس کی کوئی بنیاد نہ ہو

آج تمام دُنیا نے اُسے ستانے کی سازش کرلی تھی؛ آج کا دِن اُن لمحوں میں سے تھا جب ظالم قضا و قدر اُسے اس بات کا علم دیدیتی تھی کہ وُہ وہی پُرانا قیس ہے؛ اور پھر۔ آہ۔ پھر۔ چو رگ زن کہ جرّاح و مرہم نہ است، یہ علم اُس سے چھین لیتی تھی؛ قضا و قدر کی یہ اٹکھیلیاں تھیں، وُہ ایک ہاتھ سے خنجر گھبوتی تھی، دوسرے ہاتھ سے اُس پر مرہم رکھدیتی تھی۔

آج خنجر گھبونے کا دن تھا۔ آج اس کے آئینۂ دِل پر، اُسکی پُرانی زندگی کا۔ وُہ ہزاروں برس قبل مالی زندگی کا۔ اِنعکاس ہورہا تھا؛ اور عین جس وقت اُس کے قلب پر اُسکی زندگی کا اِنعکاس ہورہا تھا، دُنیا کی ہر شے اُس کے دِل پر جان جان کر چوٹیں لگارہی تھی۔ وُہ لڑکے کے شعر سے ہی بھنّایا ہوا تھا، اور ہوٹل کے کمرے میں ٹہل ٹہل کے

یہ باتیں کر رہا تھا کہ ایک اور آواز سنائی دی۔
ایک یکہ والا، گھوڑے کو شڑاق شڑاق ہنٹر مارتا، تماشا
بجگاتا، گویا اپنے تئیں یار کی دیوار سے جس قدر جلد
اور جس قدر دور ہو سکے لیجانے کی کوشش کرتا ہوا،
یہ گا رہا تھا:

ہم تو مرینگے یار کی دیوار کے تلے
مجنوں کو تھا جنوں بیاباں میں مر گیا۔

اس شعر نے قیس کے خیالات کی رَو کو دفعتاً اُور طرف
لیجانا شروع کر دیا: ارادہ نہایت عمدہ ہے، خدا اُس کے ارادے
میں برکت دے، اور اُسے یار کی دیوار کے تلے مرنا نصیب ہو۔
لیکن خود وُہ (قیس) بھلا اِس خوش نصیبی کی کب توقع کر سکتا
تھا۔ اُس وقت بھی۔ اُس ہزاروں برس قبل والے زمانے میں
بھی۔ دیوار کے تلے مرنا کیسا، سایۂ دیوار میں بیٹھنے کی اجازت

تک دیجاتی تھی۔ اور اب تو حالت اس زمانہ سے بدرجہا بدتر تھی۔ پہلے تو صرف اہل خانہ مانع ہوتے تھے، اب اہلِ خانہ مانع نہ بھی ہوں تو میونسپلٹی نہ اُسے بیٹھنے دیگی، نہ وہاں بستر بچھانے دیگی۔

"ہم تو مر ینگے یار کی دیوار کے تلے"! دیوار کے تلے، بیٹھ کر، دم توڑ دینا، شاید ہندوستان میں ممکن ہو تو ہو، متمدّن، میونسپلٹی۔ ظالم، پابندِ قانون، میونسپلٹی والے نجد میں تو ممکن نہیں۔ صرف ایک طریقہ مرنے کا اَور ہے، لیکن وُہ خود اختیاری نہیں، وُہ دیوار کی عنایت پر منحصر ہے، یعنی جب وُہ یار کی دیوار کے تلے سے گذرتا ہوتا ہو، تو وُہ (یعنی یار کی دیوار) لُطفاً و مرحمتاً اُس پر گر پڑے، اور اِس طرح وُہ دیوار کے تلے۔ دب کر۔ مرجائے۔ لیکن یہاں بھی وُہی ظالم میونسپلٹی کا پاؤں اڑا ہُوا ہے۔ اوّل تو اہلِ خانہ خدا

کے فضل سے ہمیشہ مکان کی مرمت کراتے رہتے ہیں، بالفرض وہ بھول بھی جاتے تو یہ بلی اگر کسی دیوار کو خطرہ کی حالت میں دیکھتی ہے تو وہ اسے گروا کے نئی اور مضبوط دیوار بنوا دیتی ہے۔

اس طرح یکہ والے کے طعن نے جو اس کے دل پر برچھی لگائی تھی۔ اس کی چبھن کو گھٹانے کی، لڑکے نے جو چرکے لگائے تھے، ان کی سوزش کو کم کرنے کی مسلسل اور ناکام کوشش کر رہا تھا، اس ہجوم طعنہائے شعرا کے مقابلہ میں اس نے اپنی قوت صرف کی تھی، اس سے وہ تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا، آخر کمرے میں نہ ٹہلا گیا، کرسی میں گر پڑا، اور اس طرح بے حس و حرکت گر پڑا گویا اس کے اعضا بے حرکت تھے نہ صرف یہ بلکہ دماغ بھی ساکن تھا، دماغ جو اس قدر پُر شدت خیالات کا جولانگاہ رہا تھا، اس وقت اپنے میں کسی خیال کو جگہ دینے سے انکار کر رہا تھا۔

حس اور جسم کی اس عطالت نے اُس پر اپنا جاں بخش اثر کیا۔ اور تھوڑی دیر میں وُہ تازہ دم ہو کے اُٹھ بیٹھا۔ خالی کس سے بیٹھا جاتا ہے۔ پھر پاس کی میز سے ایک اخبار اُٹھایا۔ یہ "مخزن" تھا۔ یُوں ہی، بغیر کسی مقصد کے ورق اُلٹ رہا تھا کہ اس کی نظر کو آخری صفحوں پر غزل کے لفظ نے اپنی طرف مائل کیا۔

یہ نیرنگ کی ایک غزل تھی۔ مقطع تھا۔

پھر ہُوئی لیلیٰ و مجنوں کی حکایت تازہ
اُن کا عالم وُہی، نیرنگ کا نقشہ ہے وُہی

مقطع کو پڑھ کے اُس کی طبیعت بہت خوش ہُوئی۔ پھر ہُوئی لیلیٰ و مجنوں کی حکایت تازہ! خُدا بھلا کرے تیرا نیرنگ! اگر کسی شخص نے دُنیا میں حقیقت کو بیان کیا ہے، یا زیادہ صحیح یہ کہ کتمانِ حقیقت سے گریز کیا ہے تو وُہ نیرنگ ہے۔

جَزَاکَ اللّٰہُ خَیْرَ الْجَزَاءِ ۔ دوسرا مصرع مَیں نہیں کہتا کہ غلط ہوگا، ممکن ہی کہ نیرنگ کا نقشہ میرے ہی نقشہ کی طرح ہو اِس لئے مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں۔ مَیں تو صرف پہلے مصرع کے لئے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہُوں"۔

قدر، برچھیاں کھبونے سے فارغ ہوکر، اب مرہم رکھنا چاہتی تھی، ورنہ کیا وجہ ہی کہ اس شعر نے قیس کو خوش کیا۔

تھوڑی دیر میں قیس، وُہی سادہ قیس تھا، اور اُسے پچھلے واقعات کا ذرا سا بھی علم نہ تھا۔

اب قیس کی طبیعت اس قدر بشّاش تھی کہ اُس سی کمرے میں یُوں تنہا نہ بیٹھا گیا۔

فلالین کا سُوٹ پہن کے، اور ٹینس بیٹ ہاتھ میں لیکر، قیس باہر آیا اور مغرب تک ٹینس کھیلتا رہا۔

(۴)

مغرب کے بعد قیس ہوٹل میں داخل ہوا۔ آج کی رات یہاں ایک جلسہ تھا، اور قیس اُس میں مدعو تھا۔ ڈرائنگ روم روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ لیڈیوں کی ریشمی گونوں کی سرسراہٹ، باریک لوچدار قہقہوں کی پُرترنم آواز، دستی پنکھوں کا جلد جلد ہلنا، اور اِس طرح اُن پُرزینت چہروں کو جو نہایت کوششوں اور گھنٹوں کی عرق ریزی سے اِس وقت کے لئے آراستہ کئے گئے تھے کبھی چھپا دینا، کبھی جھلک دکھا دینا، یا یُوں کہنا چاہیئے کہ چاندوں کا جو کسی درخت کے نیچے سے دیکھے جا رہے ہوں کبھی پتوں میں چھپ جانا، کبھی ظاہر ہو جانا، سفید بُراق گردنوں پہ موتیوں کے ہاروں کا چمکنا، کسی خوش قسمت شخص سے ہاتھ ملاتے وقت برقی روشنی کا، لیڈی کے ہاتھ کی انگوٹھی پر پڑ کے دمکا دینا کسی کونے سے برقِ تبسم کا گرنا، کسی صوفے سے نغمۂ خندہ کا اُٹھنا

ایک ایسا دلفریب منظر تھا کہ بہت سے لوگ جو اُس "ڈرائنگ روم" میں تھے، بات کرکے بھی خلل انداز نہ ہونا چاہتے تھے پلک جھپکا کے بھی اس نشہ کو جسے وُہ آنکھ کے ذریعہ سے پی رہے تھے ایک لمحہ بھر کے لئے بھی کم نہ کرنا چاہتے تھے، بلکہ آرام کرسی یا کسی صوفے پر سر کو ٹیکے، اس فردوس نگاہ وجنّتِ گوش میں بے حس و حرکت پڑے تھے۔

وُہ انسانی تیتریاں جنہیں لوگ غلطی سے، غلطی سے نہیں، طبیعت کے ٹھوس پن سے "عورت" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں متحرک تھیں۔ بھونرے۔ رات کا سیاہ لباس پہنے ہوئے مرد بھونرے ہی کے لقب کے مستحق ہیں۔ بھی متحرک تھے۔ کہیں ایک بھونرے کے گرد دو تین تیتریاں تھیں کہیں ایک تیتری کے چاروں طرف تین چار بھونرے جمع تھے۔ تیں! اس بزم کے کھیا تھے۔ سب کی آنکھیں ان پر پڑ رہی

تھیں۔ سب لیڈیوں کے لئے ان میں کشش تھی۔ غیر ملک کے آدمی کی طرف ہر شخص مائل ہوتا ہے۔ عرب، وُہ بھی نجد کا عرب کس کے لئے عجوبہ نہ ہوگا۔ ان کی طبیعت اس وقت خاص طور پر بشاش تھی؟ نجد کا حال بیان کر رہے تھے۔ لوگ سوالات کر رہے تھے، وُہ اُن کا جواب دیتے تھے۔ مگر ایک نوجوان، ہیجدہ، نوزدہ سالہ سیاہ پلکوں والی، سیاہ بالوں والی، لڑکی جو زرین تاجوں یعنی سُنہری بالوں۔ مُذہب تیروں یعنی سُنہری پلکوں والی لیڈیوں میں ایسی ہی عجیب معلوم ہوتی تھی، جیسا اُن غربیوں میں قیس جیسا مشرقی۔ ایک غیر معلوم کشش سے قیس کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور خود قیس کی طرف کھینچی جا رہی تھی۔ قیس کی باتوں میں بے نہایت دلچسپی، اِس لڑکی کے پُر اشتیاق چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ کوئی اور سوال کرتا تو قیس جواب تو دیتے، اور اچھی طرح جواب دیتے، غیر تسکین بخش جواب دینا تو اخلاق و

نزاکتِ طبیعت کے خلاف تھا۔ مگر کچھ بہت خوشی سے جواب نہ دیتے تھے۔ لیکن اگر یہ لڑکی سوال کرتی۔ اور اور سائل ذرا فرصت دیتے تو یہ سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتی تھی۔ تو قیس اس طرح جواب دیتے گویا اُنکی تمام رُوح، اُنکی تمام قابلیّت، خوش کرنے کی تمام قوّت و خواہش، اس جواب میں آکر جمع ہو گئی ہے۔ اوروں کو جواب دیتے وقت بھی، اُنکی نظر۔ دزدیدہ نظر۔ اُن سیاہ پلکوں۔ اُن چمکدار سیاہ پتلیوں اور نرم سیاہ بالوں ہی میں جاکر پھنس جاتی تھی، اور وہاں سے واپس نہ آنا چاہتی تھی۔ اور اگر خاص اس کے جواب میں اُسکو مخاطب کرنا ہوا تو پھر اُنکی نظروں میں گویا کمرے بھر میں کوئی اور ہوتا ہی نہ تھا۔ اور اس لڑکی میں بھی، ان گھنی سیاہ پلکوں، اور سیاہ چمکدار پتلیوں اور نرم سیاہ بالوں کا، قیس کے لئے کچھ ایسا سحر تھا، اور اس کے دماغ پر ایسا اثر کرتا تھا کہ اُسے یہی چیزیں اُس کے سامنے تیرتی، اُس کے

دماغ میں چکر کھاتی معلوم ہوتی تھیں ۔
لڑکی کا چہرہ نہایت دلکش تھا، لیکن قیس کے سطح دماغ پر اس کے چہرے کا نقش نہیں جم رہا تھا، بلکہ وہی گھنی سیاہ پلکوں سیاہ پتلیوں اور سیاہ ریشمی بالوں کا ۔
ان میں اس کے کچھ ایسی کشش تھی کہ اس کی نظر سکڑ سکڑ کے، انہیں پر جمع ہوجاتی تھی، اور دوسری چیزوں پر، چہرے پر رُخساروں پر پڑنے سے بھی ابا کرتی تھی ۔
ایک طرف سے تجویز ہوئی ۔ قیس کو اتنا ہوش نہ تھا کہ معلوم ہو کہ کس نے تجویز پیش کی اور کیا تجویز تھی، صرف لوگ اس کے پاس سے ہٹتے نظر آئے ۔ کہ پیانو کا شغل کیا جائے ۔ عورتیں اور مرد پیانو کے گرد جمع ہوگئے، اُن کے پاس سے بھیڑ چھٹ گئی ۔
مگر قیس مسحورانہ وہیں بیٹھا رہا؛ اُسکی آنکھوں میں وہی سیاہ

گھنی پلکیں، وہی سیاہ ریشمی بال چھا رہے تھے۔ ہاں چہرہ ایک سفید نقطہ کی طرح نظر آتا تھا۔ پیانو سے آواز نکلنی شروع ہوئی، اور عورتوں کی باریک اور مردوں کی بھری ہوئی آوازیں پیانو کا ساتھ دینے لگیں۔ لیکن اسکی آنکھوں میں وہی سیاہ؟ گھنی پلکیں، وہی سیاہ چمکدار پتلیاں، وہی سیاہ ریشمی بال اس طرح چکر کھا رہے۔ جیسے شراب کے نشہ میں سامنے کی چیزیں پھرتی اور دھندلی دھندلی نظر آتی ہیں۔

ان دھندلی دھندلی سیاہ چیزوں میں وہ سفید نقطہ جو اسے اپنی طرف اس قدر مائل کیے ہوئے نہ تھا۔ بولتا نظر آیا، اور اس کے کانوں میں یہ آواز پہنچی۔

"مگر مسٹر قیس! آپ نے وہاں کی عورتوں کا حال بیان نہ کیا، ان کا حسن مغربی حسن سے ضرور فرق رکھتا ہوگا"؟

اس پر وہ چونکا، اور گویا عالمِ رویا سے عالمِ بیداری

میں آیا۔ اس وقت اُسے معلوم ہُوا کہ وُہ لڑکی اس کے پاس بیٹھی ہے، اور سوال کر رہی ہے۔ اس کے گرد اور کوئی نہیں ہے۔ قیس نے اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں پر پھیر کر، گویا اپنے دماغ اور دماغ کی کھڑکیوں کو اپنی اصلی حالت پر واپس لانے کی کوشش کر کے جواب دیا:۔

"معاف کیجئے گا، میں ایک خیال میں چلا گیا تھا۔ مگر آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں آپ بھی گانے کا لطف اُٹھائیے"

لڑکی نے جواب دیا "مجھے معاف کیجئے، اگر میں نے اِس سوال سے آپ کے لُطف میں خلل ڈالا۔ مجھے خیال نہ تھا کہ آپ حالتِ استغراق میں ہیں"۔

"یہ معافی مانگنا تو دو طرفہ جاری رہیگا اس لئے اسکے ختم کرنے کے لئے میں کہتا ہوں کہ میں نے معاف کیا، مگر حقیقت میں یہ تو فرمائیے کہ آپ اس وقت جبکہ

پیانو آپ کو بُلا رہا ہے اور ہر شخص آپ کی آواز کی حلاوت سے
متمتع ہونے کا آرزومند ہے۔ میرے پاس بیٹھ کر کیوں آپ اپنا
وقت ضائع کر رہی ہیں"۔
کہنے کو تو وہ کہہ گیا، لیکن قیس دل میں خدا سے چاہ رہا تھا
کہ وُہ جہاں تھی وہاں سے نہ ہٹے۔ اُس کی اِس دلی خواہش کو
لڑکی کے اس جواب نے پُورا کیا۔
"مجھے اِس وقت نہ گانے، نہ گانا سننے کی خواہش ہے۔
مَیں خوش ہُوں کہ اِس وقت پیانو نے آپ کے پاس سے بھیڑ
کو ہٹا لیا ہے، کیونکہ لوگ اس قدر آپ سے سوالات کرتے ہیں کہ
مجھے کچھ پُوچھنے نہیں دیتے۔ آپ بالکل انہیں کے حصّے میں
آجاتے ہیں۔ مگر مجھے خوف ہے کہ مَیں آپ کے پیانو کا لُطف
اُٹھانے میں حارج ہو رہی ہوں"۔
"بالعکس آپ نہ سُننے میں مدد دے رہی ہیں۔ مَیں اِس وقت

نہ معلوم کیوں، پیانو کیا موسیقی سے بیزار ہوں اور چاہتا ہوں
کہ میرا خیال اُس طرف نہ جائے، آپ پُوچھئے میں خوشی سے
آپ کے سوالات کا جواب دُونگا ،،

"مَیں یہی چاہتی تھی کہ نجد کی عورتوں کی کچھ کیفیت آپ
بیان کریں۔ ظاہر ہے کہ اپنے ہی مجنوں کے حالات میں زیادہ
دلچسپی ہوگی۔ یہ بتائیے کہ وہاں کی عورتوں کا اثر مردوں پر
ہے یا نہیں، مشرق اس معاملے میں ہمیشہ غرب کا مطعون
رہا ہے۔ اگرچہ مَیں ان طعنوں کو بہت کچھ بے بنیاد سمجھتی ہوں،
تاہم آپ سے اس کے متعلق ایک جواب شافی سُننا چاہتی ہوں'
اُنکے حسن اُنکے رنگ اُنکے خدوخال کا بھی کچھ حال بیان کیجئے!
بلکہ میرا پہلا سوال تو یہی تھا۔ آپ نجد کے حُسن میں اور میں محض
مثالاً کہتی ہوں یورپ یا غرب کے حُسن میں کیا مابہ الامتیاز
پاتے ہیں۔ شاید کیا غالباً حُسن تو وہیں کا آپ کی نظروں میں

کھبتا ہوگا، لیکن اس کھبنے کی وجہ بھی بیان نہ کیجئے گا۔"

قیس نے ذرا مسکرا کے جواب دیا "آپ کے سوالات نہایت دلچسپ ہیں، مگر سب ایک ہی دفعہ نہ پوچھ ڈالیے۔ نجد میں عورتوں کا کیا اثر ہے، اس کا حال تو آپ کو صرف اس مثال سے معلوم ہو جائیگا جو آپ نے ضرور کہیں نہ کہیں پڑھی ہوگی اگر آپ کو مشرقی لٹریچر ترجموں ہی کے ذریعے سے ملا ہی کہ نجد میں ایک مشہور شخص جو میرا ہمنام تھا، ایک عورت کے لئے دیوانہ ہوگیا، بطور استعارہ کے لفظ دیوانہ استعمال نہیں کیا ہی، بلکہ حقیقت میں وہ فاطر العقل ہوگیا تھا۔ چنانچہ آج تک کتابوں میں، نظم میں، نثر میں، عرف عام میں وہ مجنوں کے ہی لفظ سے یاد کیا جاتا ہی جب تک زندہ رہا۔ اپنی محبوبہ لیلیٰ ہی کا نام لیتا رہا۔ اُسی کے خیال کی پرستش کرتا رہا یہ واقعہ ہی، خیالی فسانہ نہیں؛ اس شخص نے وہ نام حاصل کیا

کہ آج مَیں بھی اُس کا ہمنام ہونے پر فخر کرتا ہوں، پس لیلیٰ کا اثر
مجنوں پر، نجد کی عورت کے نجد کے مرد پر اثر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔
اُس کی فتوحات کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ خُدا ہی کو معلوم ہے کہ
اس لفظ "لیلیٰ" میں کچھ جادو ہے، یا مشیت میں یہ لکھا ہے، کہ کسی قیس پر
سب سے زیادہ قابو پانے والی عورت نجد میں لیلیٰ ہی کہلائیگی
یا کیا۔ مَیں بھی (مَیں آپ سے اعتراف کرتا ہوں، مگر آپ اپنے
تک ہی رکھئے گا)، مَیں بھی نجد کی ظالم، ظالم کہوں یا مہربان،
کیونکہ اُس میں دونوں صفتیں پاتا ہوں، مَیں بھی نجد کی جس لڑکی
کا اسیر ہوں۔ اُس کا نام بھی لیلیٰ ہے۔ اور کون کہا سکتا ہے کہ
کتنی لیلائیں "کتنے" قیسوں" پر نجد میں ظلم کر رہی ہیں، بس یہ سمجھ لیجئے
کہ نجد اس وقت تک لیلائے نجد کی مٹھی میں نجد کے قیس کی
رگِ جان و رشتۂ قلب ہے"۔
پیانو کی اور پیانو کے ساتھ گانے والوں کی آوازیں اُٹھ

رہی تھیں، اور اُونچی ہو ہو کر اُس طرف کو جارہی تھیں جہاں سے
موسیقی اُتر کے اِس دُنیا میں آئی ہے۔

مگر قیس اور اُس کی سیاہ آنکھوں والی، سیاہ پلکوں والی، سیاہ
ریشمی بالوں والی۔ سامع کے لئے گویا کمرے میں خاموشی طاری تھی

ایسا سامع اور یہ مضمون! یہ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی نے ایک
اُستادِ فن کی چابک دستی سے۔ اور کہاں ہے وہ لڑکی جو
اس فن میں چابک دست نہیں، ماہر نہیں! قیس کے دل کے
اُس تار کو چھیڑ دیا تھا۔ جس سے سب سے زیادہ رقیق، سب
سے زیادہ دل دوز صدا نکلتی تھی، وہ ذرا کی ذرا ٹھہرا، پھر
اس کے چہرے پر، آنکھوں میں ایک ایسی چمک آگئی جو بتا رہی
تھی کہ وہ عالمِ تصوّر میں جس میں وہ اِس وقت تھا، کسی نہایت
دِل خوش کن نظارے کو دیکھ رہا تھا،

لڑکی نہایت شوق سے اس حالت کو دیکھ رہی تھی اور مخل

نہ ہونا چاہتی تھی، کیونکہ وہ سمجھتی تھی ؟ دیکھ رہی تھی۔ عورت کا دِل جہانِ محبت کے لئے آیئنہ جم ہی۔ کہ قیسِ نجد اِس وقت لیلائے نجد کی زیارت کر رہا تھا۔

قیس اس عالم سے باہر آیا، اور معذرت خواہی کے لہجے میں کہنے لگا: "آپ میری اِن بے موقع خاموشیوں کو خیال میں نہ لایا کریں، یہ میری عادت سی ہوگئی ہی کہ موقع بے موقع تصوّرات میں چلا جاتا ہُوں۔ آپ حُسنِ نجد، حُسنِ نجد کے خدّ و خال کا حال بھی پُوچھتی تھیں، یہ مشکل سوال ہی، کیونکہ جواب میں اتنا ہی کہہ سکتا ہُوں کہ وُہ ایسا نہیں ہوتا، ویسا نہیں ہوتا، کیسا ہوتا ہی ؟ اِس کے ظاہر کرنے کے لئے نمونہ کی ضرورت ہی، اور وُہ یہاں میرے پاس۔ نہیں کہنا چاہتا تھا، مگر یہ غلط ہی۔ اُس کا ہُوبہو نمونہ نہ سہی تو بہت مشابہ نمونہ تو میرے پاس ہی۔ اب اگر اُسے ظاہر کروں تو

یقین نہ کیا جاؤنگا، اور اگر نہ کہوں تو ادائے مطلب سے
قاصر رہونگا۔

خیر جو کچھ ہو، وہاں کے حسن کا حال اگر آپ پوچھتی ہیں تو
میں مختصراً یہ عرض کئے دیتا ہوں کہ حسنِ نجد ایسا نہیں جیسا
اِس وقت یہاں، اِس کمرے میں مشغولِ نغمہ طرازی ہے۔
نجد کی دلبری اُس شکل میں ظاہر ہوتی ہے جو۔ اجازت ہے تشبیہ دوں؟"
"آپ بھی کمال کرتے ہیں، جب میں نہایت بیتابی سے سن رہی
ہوں، آپ نے اپنے فقرے کو ناتمام چھوڑ دیا، نجد کی دلبری
کس شکل میں ظاہر ہوتی ہے؟"

"جو اِس وقت مشغولِ جرح ہے۔"

اِس پر لڑکی کھسیانی سی ہوگئی، اور کہنے لگی: "معلوم ہوا
نجد کے مرد بھی، ہمارے ملک کے مردوں کی طرح چاپلوس
ہیں، خوشامدی ہیں۔"

مَیں پہلے ہی اس اعتراض کے وارد ہونے کا خوف کرتا تھا، اور وُہی ہُوا۔ بہرحال اب مَیں واقعات کو پلٹ تو سکتا نہیں" لڑکی کے اس جواب میں "تو وُہ کیا چیز ہے جو آپ کے جرح کرنے والے کو (بقول آپ کے) لیلیٔ نجد سے مُشابہ کرتی ہے"؟ کھسیانہ پن تو تھا، مگر ایک خوشنودی کی ادا بھی شامل تھی اس پر وُہ جوش میں آگیا اور کہنے لگا۔ وُہ، وُہ زلفِ عنبریں، وُہ، وُہ گیسُوئے مُشکیں ہے جو میرے جارح اور لیلائے نجد میں مشترک ہے، وُہ، وُہ سیاہ تیر ہیں، وُہ، وُہ سیاہ مگر روشن ستارہ ہے، وُہ، وُہ غیر قابل بیانِ دلکشی ہے، جسے میرا نجد میں پلا ہُوا دِل محسوس کرتا ہے مگر الفاظ میں ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ مَیں وہاں کے حُسن کو ترجیح تو دیتا ہی ہُوں گا مگر اس ترجیح کی کوئی وجہ بھی بیان کروں۔ آپ امواجِ بحر سے پُوچھئے کہ چاند کی طرف

کیوں کھینچتی ہیں؛ آپ پروانوں سے۔ اُن میری طرح بیوقوف دلدادوں سے پوچھیے کہ شمع پر آ کر کیوں گرتے ہیں؟ آپ سُورج مکھی سے کہ پرستندۂ آفتاب ہو سوال کیجیے کہ اس نے آفتاب کو کیوں قبلہ بنا رکھا ہی؛ جب یہ جواب دے سکیں گے تو شاید میں بھی جواب کی ...... آہ! آہ! توبہ اُف! اُف یا اللہ توبہ ہے ...... "

قیس یکایک سوفا سے زمین پر گر پڑا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے۔ ڈرائنگ روم میں کہ بزم طرب تھا، اک دم کھلبلی پڑ گئی۔ سب اِس کے گرد آ کر جمع ہو گئے لیکن بیچارہ قیس بڑی تکلیف میں تھا، اسکی رگیں کھنچ رہی تھیں ہاتھ اینٹھے جاتے تھے۔ مجمع میں چند ڈاکٹر بھی تھے، اُن کی رائے تھی کہ مرگی کا دورہ ہی۔ بعضوں نے کہا کہ اِختلاج قلب کی علامتیں ہیں۔

دَوَا کے لئے لوگ دوڑے گئے، کہ اتنے میں قیس کی حالت میں بہتری ظاہر ہونے لگی، اور تھوڑی دیر میں بغیر کسی دَوَا کے، وُہ خود بخود اُٹھ کھڑا ہُوا۔

لوگوں کے پُوچھنے پر معلوم ہُوا کہ ایسا دَورہ اس سے قبل کبھی نہیں پڑا تھا۔ جہاں تک اُسے یاد تھا یہ پہلی دفعہ تھی کہ اُس کی یہ حالت ہُوئی۔

بہرحال ڈاکٹروں کا ایک مشورت کا جلسہ ہُوا۔ سب نے مِلکر، پانچ چھ، طب کی ضخیم کتابوں میں ڈوبے ہُوئے، دبے ہُوئے دماغوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مرگی کا دَورہ تھا، اور اُس کے لئے علاج تجویز کر دیا!

(۵)

"جناب ایڈیٹر صاحب پیسہ اخبار! آج مَیں نے ایک ایسا عجیب نظارہ دیکھا کہ اُسے آپ کے ناظرین تک پہنچائے

بغیر نہیں رہ سکتا"۔

میں اتفاقاً آج دوپہر کو زوولاجیکل گارڈنز (باغ حیوانات یا عرف عام میں چڑیا خانہ) کی طرف چلا گیا۔ دوپہر کا وقت تھا اور لاہور کی دھوپ۔ مشکل سے کوئی آدمی وہاں نظر آتا تھا۔ کہ اتنے میں میری نظر ایک شخص پر پڑی جس نے بے اختیار مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ ایک خوش رو جوان تھا۔ لباس تو وہی تھا جو آجکل کل ممالک متمدنہ کے لوگوں کا لباس ہے، مگر چہرہ اور خط و خال صاف بتا رہے تھے کہ ہندوستان کا آدمی نہیں ہے۔ اہالی یورپ کا بھی نقشہ نہ تھا، وہ کرختگی وہ شان تبختر چہرے سے نمایاں نہ تھی؛ چہرہ پر ایک غمگینی مگر ساتھ ہی اس کے بلا کی متانت تھی؛ ایک شعریت تھی جو الفاظ میں نہیں آسکتی؛ ایک محزونیت تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دل عمیق تحسسات کا آماجگاہ رہتا ہے۔ میں نے جلد

معلوم کرلیا کہ یہ شخص - جو خوشحال اور اچھے گھرانے کا اور اچھی تعلیم پائے ہوئے معلوم ہوتا تھا - عرب اور وُہ بھی قبلہ شعرا الکعبہ اُدبا سرزمینِ نجد کا عرب ہے - میری عربی دانی آج کام آگئی، اور میں نے وُہ کچھ دیکھا اور وُہ کچھ سُنا جواب تک مجھے حیرت میں ڈالے ہوئے ہے، اور خود میں شبہ کر رہا ہُوں کہ آیا میری آنکھ نے غلطی تو نہیں کی، اور میرے کانوں نے دھوکا تو نہیں کھایا۔ یہ شخص بایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں، اور داہنے ہاتھ کا انگوٹھا واسکٹ کی جیب میں ڈالے اور باقی چار انگلیاں باہر نکالے، ٹوپی پیچھے کو ڈالے، ایک لا اُبالیانہ انداز سے اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر پھر رہا تھا۔ کبھی اس کٹھرے کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا، کبھی اس کٹھرے کے اندر کے جانوروں یا پرندوں کو منٹوں کھڑا غور سے دیکھتا تھا۔ ایک دفعہ ایک پارک کے قریب

جس کے گرد تار کھنچا ہوا تھا ٹھٹک گیا۔ اس پارک میں، جیسا آپ کو معلوم ہی، ہرن اور اُنکے مختلف اقسام جمع ہیں۔ اِس خاص مجموعہ کے لئے لاہور کا باغ حیوانات بالتخصیص ممتاز ہے معلوم ہوتا تھا کہ یہ مجموعہ اس اجنبی کے لئے خاص دلکشی رکھتا تھا، کیونکہ میں نے دیکھا کہ وہ یہاں بڑی دیر تک کھڑا رہا۔ دھوپ کی وجہ سے ہرن، دو درختوں کے سائے کے نیچے کھڑے تھے۔ لیکن وہ انہیں اپنی طرف بلانا چاہتا تھا۔ اُس نے اوّل تو ہری، ہری دوب چھانٹ کر، اور اپنے ہاتھ میں لیکر اُن کو دکھائی، مگر پارک میں دوب کی کمی نہ تھی، اِس لئے وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی۔ پھر یہ نوجوان وہاں سے چلا گیا، اور تھوڑی دیر میں واپس آیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے جیب میں سے کچھ چنے اور جو وغیرہ نکال کر ڈالے۔ اِس دفعہ وہ کامیاب ہوا، اور کچھ ہرن اس کی طرف آگئے۔ یہاں تک تو کوئی تعجب کی

بات نہ تھی اکثر دیکھا گیا ہی کہ لڑکے اور عورتیں اور بڑے آدمی بھی جنھیں حیوانات سے دلچسپی ہی اور اس بے زبان مخلوق سے ہمدردی رکھتے ہیں، باغ حیوانات میں اگر انہیں کچھ کھلاتے ہیں. تعجب کی بات تو وُہ تھی جسے اب مَیں بیان کرتا ہُوں۔

اِن ہرنوں میں چند غزال عرب بھی تھے۔ غزالِ عرب جیسا آپ جانتے ہیں۔ ہرن کی جنس میں سب سے زیادہ حسین، متناسب الاعضا اور ہلکے بدن کا ہوتا ہی۔ یہ جب اُس کے پاس آیا تو نوجوان نے ایک وارفتگی سے اِس کے مُنہ کو پکڑکے اُس کی آنکھوں کو چُومنا شروع کردیا۔

غزال ایسی محبت کا عادی نہ تھا، اور وُہ کوشش کرکے اپنے تئیں چُھڑاکے، ہَوا میں چوکڑی بھرتا، اور اپنے خوبصورت پتلے کُھروں کے نشان زمین پر لگاتا، بھاگ گیا اور دور جاکے کھڑا ہوکے، مُڑمُڑکر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

مَیں نے دیکھا کہ نوجوان کے چہرے پر تحزونیت کے علائم زیادہ گہرے ہو گئے، اور اس نے جنگلے سے ٹیکا لگا کے عربی زبان میں یہ کہنا شروع کیا:

"معلوم ہوا، بس نجد میں ہی نہیں (اور اس فقرے سے مَیں سمجھا وُہ نجدی ہی) بلکہ ہر جگہ یہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ اسکی وجہ کیا ہے؟ ما ادری میں انکے بُرا چاہنے والوں میں تو ہوں نہیں، لَا واللہِ۔ مگر (اور یہاں اُس نے ایک شعر پڑھا جس کا اگر سرسری ترجمہ کیا جائے تو یہ ہو سکتا ہے):

عینًا لیلی کا سا چلن ہے دیکھو سارے غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھّی آنکھوں والوں کا

سوائے اس لڑکی کے کہ مَیں اُس کی توجّہات اور عنایات کا ممنون ہُوں، باقی اور مَیں نے کسی لیلیٰ چشم کو اپنی طرف مائل، اپنے اوپر رحیم نہ پایا؛ اور مصیبت یہ ہی کہ مَیں ایک بے اختیارانہ

بے تابانہ کشش سے اُنکی طرف کھنچتا ہوں۔ آہ! لیلیٰ، مَیں تیری پرستش کہاں کہاں اور کس کس چیز کو دیکھ کر کرتا ہوں؛ تجھے کچھ خبر بھی ہے؟ مگر تجھے کیا خبر اور خبر ہونے کی ضرورت ہی کیا"

یہ کہہ کر اُس نے کوٹ کی جیب میں سے ایک رومال نکالا اور چہرے پر رکھ لیا، اور آہستہ آہستہ وہاں سے باہر چلا گیا اور میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ اِس نظارہ سے کون متاثر نہ ہوتا۔ مَیں متاثر ہوا مگر اُس سے زیادہ متعجب۔ یہ معاملہ کیا تھا، قصّہ کیا تھا؟ لیلیٰ! نجد! مَیں صحیح سُن رہا تھا، یا واہمہ نے صورتیں اور مکالمہ پیدا کر دیا تھا؟ مگر مَیں صحیح عرض کرتا ہوں کہ جب مَیں اُس باغ میں گیا ہوں، نہ مَیں نجد کا خیال کر رہا تھا، اور نہ لیلیٰ کا نام میرے ذہن میں تھا۔ اس حیرت انگیز واقعہ کی توجیہ کرنے سے مَیں تو

قاصر ہوں۔ آپ اور آپ کے معزز اخبار کے بیشمار ناظرین کی خدمت میں اس غرض سے پیش کرتا ہوں کہ اس کے متعلق اپنی رائے سے بذریعہ پیسہ اخبار کے مطلع فرمائیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سیکڑوں برس کے بعد اُس سرزمین میں جس کا نام ہی ہم مشرقیوں کے دلوں میں، دو زندۂ جاوید عاشق و معشوق کی یاد زیادہ کر دیتا ہے، کیا یہ ممکن ہی۔ مَیں ڈر ڈر کر کہتا ہوں کیونکہ مَیں جانتا ہُوں کہ میرے اس خیال پر لوگ میری ہنسی اُڑائیں گے۔ مَیں کہتا ہُوں کیا یہ ممکن ہی کہ اس سرزمین میں جو اُس عجیب غریب وُڑامے کی تماشاگاہ رہی ہے، پھر وہ ایکٹر آ کھڑے ہُوئے ہوں؟

راقم متحیّر و متعجب

انتخاب از پیسہ اخبار مورخہ ۲۰ اپریل

۲۰۔ اپریل سنہ ۶ء کا "متحیّر و متعجب" شاید اس کی توجیہ نہ کر سکے۔ مگر ہمارے ناظرین کو کسی قسم کی توجیہ کی ضرورت نہیں، وُہ تمام واقعات سے کما حقہ واقف ہیں۔ صرف اِتنا کہنا ہی کہ قیس، دو دن ہوئے، دِلّی سے اپنے وطن جانے کے ارادے سے روانہ ہو چکا تھا۔ دو ایک دِن کے لئے لاہور بھی ٹھہر گیا، اور یُوں ہی باغِ حیوانات کی سیر کو چلا گیا تھا۔

باغِ حیوانات سے متاثّر و محزوں، اپنی جائے قیام پر آیا تو اُسے ایک اور مارکونیگرام ملا، جو دہلی ہوتا ہُوا یہاں آیا تھا "اس عرصہ میں میری طبیعت پھر اچھی نہیں رہی، نقاہت بہت ہو گئی تھی، کل شب کو کوئی آٹھ یا نو بجے ڈاکٹروں نے میرے ہاتھوں کو electric Battery (برقی بیٹری) لگائی اُس وقت تو ہاتھوں میں بہت اینٹھن ہُوئی اور تکلیف پہنچی

ہیں اپنے عاجز سر کو جھکاتا ہے؛ جہانتک پہنچنے، جسے ایک
دفعہ دیکھنے کی آرزو دُنیا کی آبادی کے ایک بڑے حصّہ کو
ہے؛ جس کے قریب پہنچ کے امارت واسارت، حاجت
ونعمت، علیت وجہالت، اپنے ظاہری لباسوں اپنے
بیرونی رختہائے پُرالوان کو علیحدہ کرکے، ایک سفید،
ایک بے داغ، گویا اپنے تمنّائے دلی (یعنی کاش اُسکی
طرح ہم بھی بے لوث وبے داغ ہوتے) کو ظاہر کرنے
والے لباس میں ملبّس ہوکر، عقیدت کے ولولے اور جوش
کے غلغلے کے ساتھ آگے بڑھتی ہے؛ جہاں میں نہیں کہتا کہ
گناہ نہیں ہوتا، مگر جہاں ارتکابِ گناہ کی نیّت سے
لوگ نہیں جاتے، جس کی طرف، خُدا کو اُپنے تئیں سونپنے والا
دُنیا کے کسی حصّہ میں ہو، احتراماً مُنہ کرتا ہے، جہاں موحدین
کا قبلہ، مُسلمین کا کعبہ ہے؛ جو مکّہ ہے. سکّۃ الحدید الحجاز

کے اس موقف پر قطار آکر ٹھہری۔ مدیر الموقف، جلدی سے
اپنے ادارہ سے نکلکر انتظام و نگرانی کے لئے باہر آکھڑا ہوا۔
قطار کی گاڑیوں کی کھڑکیاں کھلنی شروع ہوئیں۔ اور اُن میں
سے، عقیدت و اخلاص کے جوش میں متوالی، اپنی منزل
مقصود تک پہنچ جانے کی خوشی میں سراسیمہ، دُنیا کے ہر حصّہ
اور ہر زبان کے بولنے والی خلقت نکلنے لگی۔

اس خلقت کے ہجوم میں ہمارا قیس اور اس کا باپ بھی تھا!

ہندوستان سے واپسی پر قیس کی حالت میں کوئی بہتری
ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں کو توقع تھی، اور اس توقع میں اُسکا
بیچارہ، درماندہ حیران و پریشان باپ بھی شریک تھا، کہ
ہندوستان سے واپس آنے پر وُہ قیس لیلےٰ کا اس قدر
گرویدہ نہ رہیگا۔ سفر، اور غیر ممالک کے مناظر اس کو نئی
دلبستگیاں دِکھائینگے۔ نئی دلچسپیاں سوجھائینگے، اور وُہ

یلیٰ کے نام کی اِس قدر رٹ نہ لگائیگا ؛ (قیس کے حصُول مرام کی جہانتک اس کے شفیق باپ سے ہوسکتا تھا، اُنہوں نے کوشش کی تھی، مگر لیلےٰ کا مغرور، دولت اور عالی خاندانی کے نشہ میں سرشار۔ خاندان ان کوششوں کو نہایت حقارت سے رد کر چکا تھا)۔

اُس کا باپ سمجھتا تھا کہ وُہ اس قدر گرویدہ نہ رہیگا، مگر ہُوا کیا ؟ جسوقت وُہ واپس آیا تو ایک ایسے اِنسان کی طرح جو بہت دِنوں تک بھُوکا رکھا گیا ہو، اور پھر اس کے سامنے عُمدہ کھانا پیش کیا جائے، نتائج کی طرف سے بے پروائی کے ساتھ اُس نے لیلیٰ سے ملنے کی کوشش کرنی شروع کی۔

جب اُس کے خطوط پے درپے وہاں سے واپس آنے لگے، تو اُس نے "العصر" شہر[1] میں جو نجد کا سب سے

[1] نجد کا سب سے بڑا شہر۔

بڑا اخبار تھا لیلیٰ کے لئے خطوط چھپوانے شروع کر دیئے، وہ اپنی بے تابی اور بے صبری کو نہایت پُر درد الفاظ میں ظاہر کرتا تھا (ل۔ کو (ابھی اس میں اتنی عقل تھی کہ لیلیٰ کا نام درج نہیں کرتا تھا).

تمہارے قدموں تک میری جبین کا پہنچنا کجا، تمہارے حضور تک میرے فریاد نامے بھی نہیں پہنچتے؛ نہیں پہنچنے دیئے جاتے. تمہارے جو دو ایک مارکونیگرام مجھے ملے ہیں انہوں نے مجھے اس کی ہمّت دلائی ہے کہ مَیں تم سے تمہاری توجّہات کی مداومت و ابقا کی التجا کروں. مگر عرصے سے وُہ بھی بند ہیں. کیا ایک مُلک، ایک شہر میں رہکر مَیں خیریت مزاج کی خوشخبری سے بھی محروم رہونگا؟ آہ نجد میں رحم نہیں ہاں نجد میں شاید ہو مگر تمہارے خاندان میں نہیں. ق.

کچھ یہ ہی ہوتا آیا ہی کہ محبّت میں لوگ سمجھتے ہیں کہ باقی دُنیا

کی آنکھیں نہیں، اور کوئی اُنکے راز کو نہیں جانتا، اُن کی کیفیت کو نہیں دیکھ سکتا. چنانچہ وُہ یہ سمجھتا تھا کہ کوئی اس اِشتہار کے' (سوائے لیلےٰ کے) معنی نہ سمجھیگا؛ نہ کسی کو یہ پتا چلیگا کہ کس کی طرف سے ہی اور کس کے لئے ہے.

مگر ان اِشتہاروں نے، اس کی اور اُس کے ساتھ لیلیٰ کے خاندان کی خُوب شہرت کی؛ وُہ ظاہر ہے کہ ان کو پڑھ پڑھ کے آگ بگولا ہو گئے. اور اُنہوں نے "العصر" پر ازالہ حیثیت عُرفی کے دائر کرنے کا تہیّہ کر لیا. لیکن لوگوں نے بیچ میں پڑ کر مصالحت کرا دی ایڈیٹر نے نہایت لجاجت سے معذرت خواہی کی. اور اس بات کا یقین دلایا کہ آئندہ سے اس قسم کے اِشتہار کسی صُورت میں نہ چھپنگے.

یہ حالتیں دیکھ کر اُس کا والد حیران تھا اور اُسے کوئی ترکیب نظر نہ آتی تھی. لیلیٰ کا خاندان اپنی طرف اڑا ہُوا اُدھر قیس

کی یہ کیفیت. بیچارہ اپنے تئیں ایک بڑی مصیبت میں مبتلا پاتا تھا. آخر اُس نے مذہب کی طرف رجوع کی، اور اس امید پر کہ وہاں پہنچکر قیس رُو براہ ہوگا، اور وہاں اس کے اصلاحِ مزاج کی دُعا قبول ہوگی، وُہ اپنے (دُنیا کی نظر میں دیوانے) بیٹے کو لیکر مکہ آیا.

وہاں آیا، جہاں ہر شخص اپنی عزیز ترین تمنا لیکر آتا ہے، جس در کے سامنے، جس چھت کے نیچے، سب سے زیادہ صمیمی، سب سے زیادہ دلی دعائیں مانگی جاتی ہیں یا زیادہ صحیح یہ کہ ہر جگہ سے زیادہ قوی اُمیدِ اجابت کے ساتھ تختِ سماوی کی طرف جاتی ہیں (ورنہ صمیمیت تو دنیا کے ہر گوشہ میں فریادِ قلب کر رہی ہے) وہاں وُہ اُسے لیکر پہنچا. خود خضوع و خشوع سے دُعا مانگی اور قیس سے بھی کہا کہ اپنی قابلِ رحم حالت سے نجات پانے کے لئے دستِ دُعا اُٹھائے

اور قیس نے دستِ دُعا اُٹھائے، اور انتہائے صمیمیت،
غایت تضرع سے، اعماق دِل سے نکلنے والی صَدا سے
دُعا مانگی. مگر کیا؟ وُہی جو اُس نے سیکڑوں برس پہلے
مانگی تھی، اور جو ہر قیس طبیعت چاہے وُہ کہیں ہو اور
کسی زمانے میں ہو، مانگیگا:-
"میں جس مصیبت میں مُبتلا ہُوں، خُدا کرے وُہ کبھی
نہ کم ہو +



دوست کا خط

تُو پیارے دوست کا پیارا خط ہی! تجھ میں وُہ کونسی
برقی شے بھری ہے جو میرے دل کو دھڑکاتی ہی! تجھے
کھولتے وقت ہاتھ کیوں کانپنے لگتے ہیں؟ آخر تجھ میں اور
کاغذوں سے کیا برتری ہے؟ تو بھی کاغذ کا ٹکڑا، وُہ بھی
کاغذ کے ٹکڑے، بلکہ وُہ تو تجھ سے زیادہ بڑے ہیں۔
ہاں، باعثِ تفاخر و تفوّق یہی ہی نا کہ دوست نے تجھے لکھا،
لبِ پان خوردہ سے، اُف، لبِ پان خوردہ سے لفافہ بند
کیا؟ بیشک بیشک، یہ بہت بڑا تفوّق ہے۔ اچھا میں تیرا
امتحان لیتا ہوں، تجھے نمبر دیتا ہوں، سو میں دیکھوں تجھے

کتنے نمبر ملتے ہیں ۔

اُنکے ہاتھوں سے چھوے جانے کے ——— ۴۰

اِس بات کے کہ دستہ کاغذ میں سے تجھے ہی منتخب کیا ——— ۵۰

اُن لبوں نے لفافہ کو بند کیا ——— ۷۰

۱۶۰

ہیں! تونے سو سے زیادہ نمبر پائے ۔ نہیں یہ امتحان ٹھیک نہیں ہوا، دوسرے طریقہ سے شمار ہونا چاہیے ۔

اِس بات کے کہ تجھے میرے لئے منتخب کیا۔ اور کسی دوسرے کے لئے نہیں منتخب کیا ——— ۶۰

اِس بات کے کہ اُنکے قلم کی تحریر تجھ پر ہے ——— ۴۰

اِس بات کے کہ اُنکے چہرے کا عکس تجھ پر پڑا، کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ خطرات کو لکھا ہے ——— ۵۰۰

۶۰۰

کیا! پھر سو سے زیادہ ہوگئے ؛ یہ ٹھیک نہیں ۔ اچھا تیسری بار پھر امتحان :۔

اِس بات کے کہ تو اُنکے مژدہ صحت و

خوشنودیٔ مزاج کی خبر لایا ——— ۸۰

اِس بات کے کہ تجھے چاک کر دینے کا حکم ہے ——— ۱۰۰۰

یہ کیا؟ نمبر تو سو سے پھر بڑھ گئے۔

نہیں نہیں! مَیں بیفائدہ کوشش نہیں کرنیکا۔ تو امتحان سے بالا، موازنہ سے اعلیٰ، قیدِ مقابلہ و منافسہ سے آزاد، پیارے دوست کا پیارا، پیارا، ہائے مَیں کیسے ظاہر کروں کتنا پیارا، خط ہے۔ تو سینہ سے لگایا جائیگا، تو نظرِ اغیار سے بچایا جائیگا، مگر (حاشا) تو چاک نہیں کیا جائیگا۔ تو میرے پاس محفوظ رہیگا، اور مَیں ہزاروں مرتبہ تجھے تنہا گوشوں میں پڑھوں گا *

اگر میں صحرا نشین ہوتا

اگر میں صحرا نشین ہوتا، تو طلوع و غروبِ آفتاب کے نظارے سے ہر روز متاثر ہوتا۔ چاندنی رات کو میں دیکھتا کہ چاند اور ستارے زمین کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں؛ اندھیری رات میں تمام عالم کی تاریکی اور ہر چیز کی خاموشی مجھ پر اثر کرتی اور میں اپنے دل میں عمیق حسیات محسوس کرتا۔ میں کسی وادی میں گذر رہا ہوتا، پُر فضا گھاٹی کے پھول۔ اور ان پھولوں کو دیکھ دیکھ کر رنگین اور لطیف گانے گانیوالی بلبل، ہلکی آواز سے گرنے والے آبشار مجھے گھنٹوں حیرت زدہ رکھتے اور میں پُر مسرت زندگی بسر کرتا۔

مگر شہر نشین ہوں، اور کیا دیکھتا ہوں ؟ ایک غریب مزدور کا لڑکا سڑک سے گذر رہا ہے، ایک عالیشان محل کے سامنے (جس میں عیش و تنعم و گناہ کے سوا کچھ نہیں) کھڑا ہو جاتا ہے؟ کھڑکیوں کو کھڑا گن رہا ہے اور یوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ آگے چلکے، ایک بڑی پُر رونق دوکان کے سامنے کھڑا حسرت سے مُنہ اور آنکھیں کھولے، دیکھ رہا ہے، مٹھائیوں کو دیکھ دیکھ کے اُس کے مُنہ میں پانی بھر بھر آتا ہے لیکن وہ خرید نہیں سکتا۔

ایک بے والی، وارث لڑکی کو دیکھتا ہوں، اور سوچتا ہوں کہ اُس کا تبسم معصوم ایک بوسہ ناجائز پر (جس کے ساتھ اس کا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ پیسے دیئے جائینگے) قربان ہو جائے گا۔

پھر ایک شرابی سامنے سے گذرتا ہے، جسکی قوت معنویہ

سب محو ہو چکی ہی؛ جو جان جان کر زہر پی رہا ہی۔
پھر ایک چور پر نظر پڑتی ہی جسے فلاکت وحاجت کے کوڑے نے چوری پر مجبور کیا، اور جسے اوروں کو عبرت دلانے، اور اُسے آیندہ چوری سے باز رکھنے کے لئے زندان کو لئے جارہے ہیں! گویا فلاکت وحاجت زندان سے ڈرتی ہی!
ایک متعفن اور گھنی بیماری میں مُبتلا فقیر کو دیکھتا ہُوں، اور دیکھتا ہُوں کہ ایک فنٹن، بھڑک دار فنٹن میں بیٹھا ہوا امیر اُدھر سے گذرتا ہی اور اس فقیر کو دیکھ کر تنفر سے مُنہ پھیر لیتا ہی۔
آہ! شہر نشین ہُوں، روتا ہوں اور کہتا ہوں:
اَے مایوس دلو! اَے مدفن سرور مزارو! تمہارا خیال مُجھے رُلاتا ہی، تمہیں سوچتا ہوں اور تم پر دِل کڑھاتا ہوں۔ جیسا میرا مایوس دِل ہی ایسے کتنے ہو چکے ہیں، اور کتنے

اِس وقت ہیں! شاید، پہلے، اِتنے دِل خون نہ ہوتے ہونگے، مگر اب؟ اب تو مجھے ہر جگہ سینہ چاکی و دل شکستگی نظر آتی ہے۔

دھڑک، دھڑک، اے قلبِ یاس بنیاد! اپنے لئے، اپنے جیسے لاکھوں مصیبت زدہ دلوں کے لئے دھڑک، ٹکڑے ٹکڑے ہوجا، جا، جا دُور ہوجا، تیرا وجود میرے لئے بارِ گراں ہے، تو مزار ہے۔

سَیلِ زمانہ

بہے جا، بہائے لئے جا۔ نہ تجھ میں سلامتی، نہ تیرے کنارے سلامتی۔ مٹے ہوؤں کے نشان مٹائے جا۔ تیراکو کون ڈُبا، غواصوں کو نہ اُبھار، یہی تیرا کام ہے۔

تجھ میں جو خوشنما ہرے، بھرے جزیرے نظر آتے ہیں، جو پھولوں اور پھلوں سے مالا مال ہیں، جن میں خوبصورت پرند چہچہا رہے ہیں، کیا یہی لذائذِ حیات ہیں؟ وہ حسین سحر کار عورتیں، جو ہاتھ میں ستار لئے دِلرُبا گانے گا رہی ہیں، اور جادو بھری نظریں ڈال ڈال کر مجھے اپنی طرف بُلا رہی ہیں، کیا یہی جوانی کی اُمنگیں ہیں؟ آہ!

مجھے اس جزیرے کو تو دیکھنے دے ۔ ان دیویوں سے
ان پریوں سے تو ملنے دے ، ان کے گانے سے اپنے
دل کو راحت تو پہنچا نے دے ؛ مگر تو کس کی سنتا ہے ؛
تو نے کسی اور ستمگر کی سنی ہے جو میری سنیگا ۔ اچھا لے
تجھے بھی قسم ہے ؛ بہائے لئے جا بھگائے لئے جا ؛
ذرا نہ ٹھہر ۔

مگر یہ تو بتا دے ، تو مجھے کہاں سے لا رہا ہے ،
کب سے لا رہا ہے ، کیوں لا رہا ہے ، کب تک
بہائیگا ؟ ....

یہ کیا ، کیا او زیزی سے بہنا ، بھنور بن پڑنا ، طوفان
کا اٹھنا ، موجوں کا مجھے تھپیڑے مارنا ، میرے سوالوں کا
جواب ہے ؟ تجھے میرے سوالوں سے غصہ آگیا ؟ میں نے
بے ادبی کی ؟ اچھا ، اچھا ، جواب نہ دے ، بہے جا ۔

بہاتے جا۔

میری روحِ متجسس مدید نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہے: نینوا، بابل، قدیم ہند، قدیم مصر کے ٹکڑے تجھ میں نظر آتے ہیں۔ واعظ کہتا ہے: "باطل، باطل، سب باطل ہے"۔

"سکندر، ہنیبال، نوشیرواں، دارا" تیری موجوں سے کبھی کبھی اِن آوازوں سے ملتی جلتی آوازیں آتی ہیں۔ کیا شہرتِ رفتگاں یہی ہے؟ فلاسفر کہتا ہے: "دھوکا، دھوکا، سب دھوکا ہے، شہرت دھوکا ہے، نام و نمود دھوکا ہے، خود زندگی دھوکا ہے"۔

لیکن نہیں، میں نہ ملل سابقہ کو باطل، نہ شہرتِ رفتگاں کو دھوکا سمجھتا ہوں۔ اُن کی شہرت ہمت بڑھاتی ہے، لیکن یہ خیال کرکے کہ کیا ہوں میں اور کیا ہے میری ہست و بود، دِل بیٹھ جاتا ہے۔

اِس لئے بہتر یہی ہے کہ لاتعداد خس و خاشاک کی طرح، جو مجھ سے پہلے آئے اور بعد میں آئینگے بہے جاؤں۔

پس لے سیلِ زمانہ، بہے جا، بہائے لئے جا؛ اور اُس بحرِ ناپیدا کنار میں اُس عمّانِ عظیم الشان میں، اُس اوقیانوسِ ابد میں، اب یا جب تیرا دل چاہے گرادے۔



سودائے سنگین

فرامرز مرزبان جمشید جی سے، بمبئی کے قلابہ اسٹیشن پر اتفاقاً ملاقات ہوئی اور اس ملاقات نے مجھے بہت حیرت میں ڈالا۔ سال بھر سے میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ اس عرصہ میں، اُس میں کس قدر تغیر ہوگیا تھا! اُس وقت اس کے ہلکے چہرے کے اداس رنگ پر، مسرتِ شباب کا غازہ گلگوں بھرا ہوا تھا؛ آج ایک انجماد عنبریں ایک سانولے پن کے ساتھ ساتھ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کی ہلکی سرخی مائل مونچھیں ہیں۔ جنہیں اُس وقت وہ کاسمیٹک لگا لگا کے فوجی ڈھنگ پر سیدھی اور نوکدار بنایا کرتا تھا، اور جن سے اُس کے چہرے

کی زنانہ ملاحت پر ایک مردانہ وقار پیدا ہو جاتا تھا۔ آج ایک
پریشانی تھی، اور اضطراب کی تکلیف دہ کیفیت کے ساتھ
کھُلے ہُوئے ہونٹوں پر ایک تھکن برس رہی تھی جس سے ظاہر
ہوتا تھا کہ اس نوجوان پر بھی جو ہمیشہ بنے سنورے رہنے کے
لئے مشہور تھا، زندگی کی کسالتِ غم چھا گئی تھی۔ مَیں سمجھتا
تھا کہ مجھے دیکھ کے خوش ہوگا۔ برخلاف اِس کے مَیں نے
دیکھا کہ اس اتفاقیہ مُلاقات سے جس میں اُسنے مجھ سے بات
کرنی پڑے گی وُہ بیزار معلوم ہوتا تھا۔ ذرا سا ہٹ کے
میرے بیٹھنے کے لئے اُس نے بنچ پر جگہ دی؛ اِس لئے
کہ قواعدِ اخلاق کی مخالفت صریح نہو، اس کے پتلے ہونٹوں
پر ایک مُسکراہٹ پیدا ہُوئی مگر پیدا ہوتے ہی مر گئی۔

یہ پُراجتناب طرز قبول ایسی نہ تھی کہ مجھے اس بات کی
ہمّت دلاتی کہ مَیں اپنی پُرانی عادت کے موافق "تُم" سے

اُسے خطاب کرتا؛ اِس لئے مَیں نے کہا :

"مدّتیں ہوئیں" آپ سے تو مُلاقات ہی نہیں ہوتی"۔

"ہاں" کہا اور یہ کہہ کے اپنی بائیں کُہنی کو بنچ کے ہتّے پر ٹیک کے بیٹھ گیا۔ نگاہ فرش کے پتھروں پر گاڑدی، اور سگرٹ کی راکھ گرانے کے لئے سگرٹ پر اپنی انگلی آہستہ آہستہ مارنے لگا۔

نگاہ تو اس کام پر مگر خیال کہیں اور، اس حالت میں اُس نے اپنا فقرہ جاری رکھا :

"ہاں، پچھلے سال اُس واقعہ کے بعد، مَیں والدہ کے ساتھ بمبئی آیا تھا، اُس وقت سے اب تک بند درہ میں ہیں، کبھی یہاں آتے ہی نہیں آج کا آنا مستثنیٰ سمجھا....

کس واقعہ کا مجھ سے ذکر کر رہا تھا؟

ٹوٹے ٹوٹے فقرے کہتا تھا، آنکھیں سگرٹ سے

نہ ہنساتا تھا۔ پھر گویا اِس بات سے متعجب ہو کر کہ ایک ہی دفعہ اس قدر باتیں کر گیا، وُہ یکایک اپنے فقرے کو تمام کئے بغیر رُک گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نوجوان جس کی تمام گذشتہ زندگی مجھے معلوم تھی، یاس کی ہوائے گراں سے بیتاب ہے۔

یہ نوجوان جو ہمیشہ متبسم و ظریف رہتا تھا یہاں تک کہ اپنے آلام عاشقانہ میں بھی کوئی ایسی حکایت ضرور کہتا جو تمہیں خوش کرتی، اپنی سب سے زیادہ یاس انگیز حیات کیفیات کی رقیق اور پُرتاثیر زبان سے تصویر کھینچتے ہوئے، یہ دیکھ کر کہ اُس کی سرگذشت تمہارے دل میں رِقّت پیدا کرنے کو ہے، ایک نہایت ہی چھوٹا سا لطیفہ اپنی سرگذشت میں غیر معلوم طریقہ سے داخل کر کے تمہارے مُنہ سے ضرور ہی قہقہہ نکال لیتا۔ غرضیکہ یہ ہمیشہ لطیف و شوخ، ہمیشہ متاثر، لیکن ساتھ ہی ہمیشہ ہنسنے ہنسانے کے بہانے ڈھونڈھنے والا نوجوان،

میں ثابت قدم رہنا چاہتا ہے اور اس طرح اپنے تئیں دھوکا دیتا ہے۔ خود کہا بھی یہی کرتا تھا: "زندگی میں سے موسیقی اور شعر، پھول اور روشنی، پھر ان سب کا مجموعہ، ان سب کا ماحصل عورت کو نکال ڈالو، پھر دیکھیں کیونکر دنیا میں زندہ رہنے کی قوت اپنے میں پاتے ہو؟"

اگر زندگی انہیں چیزوں سے عبارت ہوتی اور ان کی حقیقت بھی صرف تخیل سے مترکب ہوتی تو ہم سب کتنے خوش قسمت ہوتے۔ مگر یہ رنگین چیزیں ہوا ہیں اور رنگ، کہ اڑ جاتی ہیں، غائب ہو جاتی ہیں اور یہ عورتیں! کتاب حیات کی اس جلد کو ایک جلد زر اندود کی شکل میں وہ ہی سے دیکھتا تھا۔ اسے پڑھنے، اس کے بابوں اور صفحوں کو جو آنسوؤں سے لکھے گئے ہیں ابھی دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ابھی اسے یہ حقیقت معلوم نہیں ہوئی تھی، کہ

بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کا خوش خوش مُسکرانا یا مُنہ بنانا مجھے کل حال بتا دیتا تھا۔

یہ راز کہنا اور سُننا، کس طرح اور خاصکر کس لئے شروع ہُوا تھا؟

مجھے یاد پڑتا ہے، کہ مجھے اپنا رازدار بنانے کی عادت کی اِبتدا اُس نے اس طرح کی تھی:

ایک دِن صبح ــ آج کی قلّابہ سٹیشن کی مُلاقات سے پانچ سال قبل ــ اپالو بندر پر مَیں نے اُسے دیکھا۔ اپالو بندر پر صبح کے وقت اُس کا ہونا، اس وقت کی زندگی کے لحاظ سے ذرا عجیب شے تھی ــ مجھے دیکھتے ہی مجھے اُس کی وجہ بتائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دن اُس کی طبیعت میں باتیں کرنے کا بہت جوش تھا، اور چونکہ اسے ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جس سے وُہ دِل بھر کے

باتیں کرسکتا تھا، اس لئے وُہ خوش معلوم ہوتا تھا۔ جھٹ کہنے لگا: "بھائی کیا اچھا ہوا تم مِل گئے، تم سے مشورہ کرونگا۔ مجھے ایک شادی کے لئے ایک ہدیہ تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ (کہتے وقت ہنسنے اور اپنے تئیں بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا) ہمارے عزیزوں میں سے ایک لڑکی بیاہی جانے والی ہے۔ اِس کے مناسب ایک ہدیہ تیار کرنے کے لئے مَیں نے کس قدر اپنی طبیعت پر زور ڈالا، اور انتخاب کرنے تک کن مشکلوں کا سامنا ہُوا۔ پہلے میں نے چاہا کہ کوئی جڑاؤ زیور دوں، مثلاً ایک فیروزہ یا عقیق کی انگوٹھی یا ایک ننھی سی سونے کی سینے پر لگائی جانے والی گھڑی۔ مگر مَیں نے اس خیال کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ ان چیزوں کے دینے میں کوئی نزاکتِ طبع، ظاہر نہیں ہوتی۔ ان چیزوں کے دینے کے یہ معنی ہوسکتے کہ مَیں اُس کے مذاق پر حکمانہ اثر ڈالنا چاہتا ہُوں۔ ایسی انگوٹھی

پہنو، ویسی گھڑی لگاؤ" کے قبیل سے اس پر ایک دباؤ ڈالتا ہوا۔ اس کے علاوہ اس میں ایک خواہش نمائش بھی ملی ہوتی، گویا میں (میری چیز وہ ایک ہی بات ہے) اس کی انگلیوں میں اس کے سینے پر نظر آؤں۔ سچ پوچھو تو اس میں ایک گنوارپن کا پہلو بھی تو نکلتا ہے۔ ہے نا؟ یہ ایسا ہی ہے جیسا ایک تحفہ دینا جس کی قیمت بھی اس پر کھدی ہو۔ یہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتیں، دیکھنے والے آنکتے اس انگوٹھی کی لاگت پچاس روپیہ کی ہوگی، یہ گھڑی ڈیڑھ سو کی ہوگی"۔

یہ فرامرز جمشید جی، جو اس دن اپولو بندر میں کھڑا کبھی اس پاؤں پر زور دے کے، کبھی اس پاؤں پر، اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو نہایت وضاحت سے بیان کر رہا تھا۔ اور فلسفہ ہدایا پر لکچر دے رہا تھا، پانچ سال بعد اس بڈھے نوجوان

سے کتنا الگ کس قدر دُور نظر آتا تھا جو سرنیچا کئے، رنجیدہ شکل میں سگرٹ کی راکھ گرا رہا تھا اور مجھ سے آنکھیں نہ ملانی چاہتا تھا غرضیکہ اُس دن فلسفہ بدایا پر لکچر دیتے ہُوئے کہہ رہا تھا:
"مَیں نے پھر ایک اَور چیز سوچی، انگریزی اور ہندوستانی مٹھائیوں کا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی جو مل سکیں، تاج محل ہوٹل کی مٹھائیاں، خونڈانٹ وغیرہ۔ کا ایک خوان بھیجوں۔ مگر اُن کی صرف ایک دو دن کی زندگی ہوتی ہیں چاہتا تھا کہ......" فرامرز کی اصلی تمنّا ہیں اِن تمام باتوں سے سمجھ رہا تھا۔ اس کا بلا لزوم، مجھے اس قدر سمجھانا، ایک شادی کے تحفہ کے لئے اِس قدر تفصیلات بیان کرنا اِن باتوں ہیں جو وہ بیان کر رہا تھا، وُہ مطالب جو وُہ بیان نہیں کر رہا تھا صاف جھلک رہے تھے۔
کہنے لگا: "آخر کار انتخاب کر ہی لیا۔ آؤ دکھاؤں" یہ کہتا

ہوا ، مجھے گھسیٹ کر ہارکس اینڈ کمپنی جوہریوں کے ہاں لیگیا۔
وہاں ایک کمرے میں لیجاکر ، بیچنے والے سے پوچھنے لگا:
"سنگاردان تیار ہو گیا" ؟

سنگاردان تیار ہو چکا تھا۔ وہ لایا گیا ۔ یہ چاندی کا، جس پر
سونے کا پانی پھرا ہوا تھا ، ایک جڑاؤ سنگاردان تھا ، جو ایسی
نزاکت و نفاست سے بنایا گیا تھا ، کہ بنانے والے نے
اپنی حسن طبیعت کو ایک ایک خط میں صرف کیا تھا ۔ ڈھکنے پر
چاندی کے مجسّم پھول اور پھل مثلاً سیب اور نارنگی کے پھل
اور گلاب کے پھول بنے ہوئے تھے ، ان میں جابجا موتی
ٹکے ہوئے تھے ، اندر کے خانے ، لونڈر اور عطروں کی
شیشیوں ، اور قیمتی صابونوں سے بھرے ہوئے تھے . ان
کے اوپر ایک چاندی کی کشتی تھی جس میں مخمل بچھی ہوئی تھی .
کہنے لگا : "میں نے اس کو بنوایا ۔ اِس میں عطر ہونگے"

عطر میں بسے ہوئے رومال ہونگے۔ سنگار کی چیزیں ہونگی خوشبوئیں ہونگی، اُبٹنے ہونگے، پوڈر ہونگے، وہ چیزیں ہونگی جو اُس کے مشامِ خیال میں برسوں تک کسی وقت کی بہارِ زندگی کی خوشبوئیں پہنچا ئینگی ...."

غرضیکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تئیں بھول گیا تھا اور مجھے اپنا رازدار سمجھ کے باتیں کر رہا تھا۔ یہانتک مجھے یہ سمجھانے لگا کہ اس تحفہ کو کیوں انتخاب کیا۔ وہ باتیں جو اُس کے قلب میں بھری پڑی تھیں، کسی کو سُنا کے خالی کرنا چاہتا تھا۔ شاید اُس دن میں نہ ہوتا اُسے کوئی دوسرا ملتا، اُسی سے یہ سب باتیں کہتا :

"سمجھتے ہو؟ اِس تحفے کے مطلب، اس ہدیہ کے ماخذ، اس کی رُوح کو پُورے طور پر محسوس کرتے ہو؟ اس طرح میں اس کے کپڑوں تک میں حلول کر جاؤں گا، یہ چیزیں اُن تک

ایک بوئے امل پہونچا ئینگی، اس کے خواب نوشین میں بھی میری کوئی چیز ہوگی، میں اس کے نہانے کے پانی تک میں نفوذ کرجاؤنگا، اُبٹنا مل کے، جب اپنی ہتھیلیوں میں چلو بھر بھر کے پانی لے گی، تو اس کی پتلی انگلیوں کے بیچ میں سے آبشار مسرّت بن بن کے، اُسے ایک لطیف اور معطر ٹھنڈک کی بہار دونگا۔ اور جب وہ نہا کے تولیہ سے بدن ملیگی تو اس کے منہ، اس کی گردن اس کے کندھوں سے، گویا میری رُوح کا ایک نفس خیال ایک غبار صاف وسفید بنکر، ایک معطر بوسۂ پرّاں کی طرح اُڑے گا۔ اُس کے بعد اپنے رومال کو وہ لونڈر کے دو قطروں سے بسیگی، اور جب وہ اُسے سونگھیگی تو گویا میں اس کی تمام اعماق روح میں پہنچ جاؤنگا۔"......

یہانتک پہنچ کے اُس نے یکایک یہ معلوم کیا کہ وہ ضرورت سے زیادہ کہہ گیا اور وہاں تک بڑھ گیا کہ اب واپس ہونا ممکن

نہیں، یہ دیکھ کے اُس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے، اور اپنے تمام اضطرابِ قلب کو ایک چھوٹی سی آہ میں قید کر کے کہنے لگا: "آہ! اس قصہ کو میں تمہیں کسی اَور دن سناؤنگا"۔
غرضیکہ فرامرز نے مجھ سے اپنے فسانۂ دل کا کہنا اس طرح شروع کیا تھا؛ اوّل اوّل ہماری ملاقات محض ادبیات کے جلسے ہوا کرتے تھے، وُہ بھی فارسی ادبیات کا عاشق، الفنسٹن کالج سے فارسی میں آنرز کا گریجوایٹ میں بھی فارسی ادبیات کا دلدادہ، وُہ قاآنی کے قصیدے اور پروفیسر مرزا حیرت اور حافظ کی غزلیں سُناتا، سناتا، افسانۂ دل سنانے لگا۔ اُس دن کے بعد ہر ملاقات میں اس فسانۂ دل کے باب بڑھنے لگے، یہانتک کہ میں اس کی تمام سرگذشتِ حیات سے واقف ہوگیا۔ گویا اُس کی عاشقانہ، ایسی زندگی تھی کہ میں بھی اُس میں شریک تھا، اور ہم دونوں مل کے اُس زندگی

کو بسر کر رہے تھے۔ اُس وقت میں نے یہ قطعی رائے اپنے
دل میں قرار دے رکھی تھی کہ فرامرز کا یہ عشق، اوّل اور آخری
عشق ہوگا۔ لیکن وہ اُسے قبول نہ کرنا چاہتا تھا، اگر اس کے
ادعا پر اعتبار کیا جاتا تو یہ عشق محض ایک بچپن تھا، ایک لڑکپن
کا کھیل کہ معلوم نہیں کب سے شروع ہوا، مگر شروع ہو کے
جاری رہا۔ اس کے متعلّق جو اُسے باتیں یاد تھیں ہنس ہنس کے
(گویا انہیں اہمیّت نہ دینی چاہتا تھا) بیان کرتا اور بیان کرتے
وقت اس لڑکپن پر تعجب کرتا نظر آتا تھا، لیکن نہ معلوم کیوں،
ایک تاثیرِ عمیق، اس ہنسی، اس خندۂ استہزا کے پردے کو چیر کے
نوجوان آدمی کے دل میں ایک غیر قابلِ شفا زخم کو ظاہر کرتی تھی
جو اس عشق سے پڑ گیا تھا۔ یہ دکھانے کے لئے کہ یہ عشق کیا
تھا، مذاق تھا، وہ کہتا: "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس تمام
دورۂ عشق میں، بیاہ کرنا، یا سادہ عشق و محبّت کی حد سے آگے

بڑھنا، یا بڑھنے کی جرأت کرنا، ہم دونوں کے خیال میں بھی نہیں آتا تھا۔ ہم بس سادہ ایک دوسرے کو چاہنا۔ یا یہ خیال کرنا چاہتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے عاشق ہیں گویا ہم دونوں نے ایک وقت مقررہ کے لئے حسن و عشق کا ایک مضحک ناٹک کھیلنے کا ارادہ کیا تھا، اور ہم دونوں ایکٹر تھے۔ پردہ گرتا، تماشا ختم ہوتا، اور ہم دونوں ایک دوسرے سے نہایت خوشی سے ہاتھ ملاتے، اور ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرتے کہ خوب پارٹ کیا اور اس تماشے کو جسے ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا، وہیں چھوڑ کے، ہر اک اس راستے پر پڑ لیتا جو ہمارا طالع معیشت ہمارے لئے ہمیں بتاتا۔ ہم دونوں اسے جانتے تھے، اور اسکے متعلق گفتگو کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ وہ اکثر اپنی شادی کے متعلق اپنے تصورات مجھ سے بیان

کیا کرتی ، جن گھرانوں سے اُس کے لئے پیغام آتے اُن کے متعلق مجھ سے رائے پوچھتی ' یہاں تک کہ ایک دن ماں بیٹی کا ایک جوڑا اُس کے گھر آنے والا تھا ، اور یہ معلوم تھا کہ دونوں ماں بیٹی - اُسے انتخاب کرنے کی نیت سے آرہی ہیں اُس دن ، میں نے ہی اُسے بتایا کہ کیا کپڑے پہننے چاہئیں اور کیا سنگار کرنا چاہیے - ازدواج حقیقت زندگی سے اس قدر متعلق ایک چیز تھی کہ اُس کا سوچنا بھی ممکن نہ تھا - میں تو اُس مناسبت ' (یا اگر آپ اُسے اس لفظ سے یاد کرنا چاہیں تو) اس عشق کے جہت شعری کو دیکھنا چاہتا تھا . اُس کی زندگی کو ایک خواب ابدی محبت میں رکھ کے ، اپنی زندگی بھی اسی مدہوشی میں گذارنا چاہتا تھا . بس اس قدر اور کچھ نہیں ۔ پھر گویا ان تمام حجتوں کی تائید کے لئے اس کے لبوں پر ایک ایسا تبسم ، اور اُس کی آنکھوں میں ایک ایسی نگاہ جا

ہوتی تھی جو مجھ سے بھی ایک صدقہ تصدیق مانگتی نظر آتی تھی کہ جہاں
سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کٹھ حجتوں سے خود اُس کا دل بھی
مطمئن نہیں ہوا۔ اگر مَیں ایک لفظ بھی ایسا کہہ دیتا جس سے
شُبہ ہوتا کہ مَیں ان حجتوں پر یقین نہیں کرتا، یا ذرا سا بھی خیال
ایسا ظاہر کرتا کہ مَیں اُسے اُس کی غفلت حسیات سے جو نہیں
وُہ کوشش کر کے بڑھانا چاہتا تھا، ہٹانا چاہتا ہوں، تو
مَیں یقین رکھتا ہوں کہ وُہ ایک دم سارا اعتراف کر لیتا، رو
پڑتا اور کہتا کہ میں اُس کے عشق میں مر رہا ہوں لیکن اگر
مَیں ایسا کرتا تو حقیقت میں گویا مَیں اُس کی مَوت لاتا۔
وُہ اپنے دِل کو دھوکا دینا چاہتا تھا، اور نہ مجھے بھی لازم تھا
کہ مَیں اس معاملہ میں اس کی تائید کروں، ورنہ اُس کے دل
پر حقیقت ظاہر کرنے کی چوٹ لگانا یعنی یہ کہنا کہ دراصل تم
اُسے از جان و دل چاہتے ہو، گناہ تھا۔ نہ مجھے یہی لازم

تھا کہ میں اُس کی اس کوشش میں کہ وُہ اپنے زخمِ دل کو ڈھانپنا اور اُس سے نگاہ ہٹانا چاہتا تھا، اس کی مدد کروں اور اِس طرح اس کی سلامتی کی خدمت کروں۔

لیکن کبھی کبھی وُہ مجھ سے کھُل جاتا، اور ایک دُوسرے لہجہ میں کہتا: "کہیں تمہیں خبر ہو کہ ان تمام حرکتوں سے جو لڑکپن سے زیادہ کچھ نہیں نہیں کبھی کبھی مجھ میں اک عجیب تاثیر حسرت پیدا ہوتی ہے۔ ہاں میں اس کا اعتراف کرتا ہوں، کبھی کبھی ایک ایسی حسرت پیدا ہوتی ہے کہ میں رونے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ جبکہ یہ لڑکپن، ہنسی کھیل سے آگے کے درجہ کی کوئی چیز نہیں، جب کہ اگر اس پر غور کیا جائے تو اس کی قیمت ایک قہقہ سے زیادہ نہیں، جب یہ حالت ہے تو یہ حسرت کیوں؟ .... سوچا تو خود ہی اسکی حقیقت مجھ پر ظاہر ہوئی: ہمارا یہ کھیل ہمیشہ رہنا چاہئے تھا،

اُسے تاابد ایک لڑکی رہنا چاہئے تھا، اور مجھے تاابد نوجوان لڑکا رہنا چاہئے تھا۔ یہ حالت بڑھنے والی کبھی نہ گھٹنے والے برسوں کی نامتناہی مدت کے ساتھ قائم رہنا، جاری رہنا چاہئے تھی۔ یہ خُو اب بغیر اس کے کہ حقیقت کا ضربہ اس پر لگے، یہ اُفق گریزاں بغیر اس کے کہ حد پر پہنچے، یُوں ہی دراز ہوتے رہنا چاہئے تھا۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ ضرور ایک نہ ایک وقت آتا کہ ضربہ حقیقت اس شگوفۂ خیال پر پڑ کر اسے بکھیر دیتا۔ آخر وہ وقت آیا۔ اِس کے مقابلہ کے لئے ہم کیا کر سکتے تھے؟ بیاہ؟ اس کا نتیجہ عینی یہی نہ تھا؟ کیونکہ بیاہ کے بعد یہ خواب بالکل ملیامیٹ نہ ہو جاتا؟ مگر نہیں ملیامیٹ نہیں ہوا ہمیں اُس زندگی کے شعر کو یاد رکھنا مقصود تھا، سو وہ شعر اب بھی شعر بکر و تازہ ہے، اس کی یاد زندہ رہیگی اور زندہ ہے اب ہم ایک دُوسرے کا خیال کر کے، اگر زیادہ لاہوتی،

زیادہ رُوحانی مناسبت کے ساتھ (یہانتک کہ اب اس کے متعلق باتیں بھی نہیں ہوتیں) زندگی بسر کر رہے ہیں. گویا دُور سے، یادِ ایام کے ساتھ ایک خاموش عاشقی معشوقی لیکن ......" لیکن کے بعد فقرے کو پُورا نہیں کرتا، پھر اس تقریر کو جسے میں کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا ایک لمبے اور ٹھنڈے سانس سے، جس میں بڑی کوشش سے وُہ ایک قہقہہ بھی شامل کر سکا، ختم کر کے کہنے لگا: کیا معلوم تم میری ان بے تکی باتوں پر دل میں کس قدر ہنستے ہو گے، اور میری حقارت کرتے ہو گے؛ اور اجی سچ پُوچھو تو ساری اصل وحقیقت، سارا لُطفِ شعر یہاں ہے" یہ کہہ کے اپنے چہرے پر شوخی او شرارت کا رنگ لا کے، مثلاً سامنے چوپاٹی پر سمندر کے کنارے بنچ پر کوئی حسین پارسن بیٹھی ہوتی، اُس کی ریشمی ساڑھی کو سمندر کی ہوا ہٹا کے، اُس کی گوری گردن، اور ہلکے کپڑے میں چھپے ہوئے سینے کی جھلک دکھاتی کنکھیوں سے اُس کی طرف

اشارہ کرتا۔

میں اپنے دل میں کہتا: "بدقسمت بیمار، غیر قابلِ شفا بیماری میں بیمار" لیکن کچھ دنوں بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُسے اپنی بیماری کا علاج مل گیا تھا۔ اب ایک نشوۂ بے قید کے ساتھ اُن لوگوں کی طرح جو زندگی میں مزہ ہی مزہ کرنا چاہتے ہیں، اُس نے اپنے تئیں اندھا دھند عیش میں ڈال دیا، ایک جاڑے کا موسم متواتر گرانٹ روڈ کے تھیٹروں ہی میں گذارا مجھ سے کہتا: دِن سو سو کے گذارنا بھی کیا مزے کی چیز ہے۔ انسان چونکہ سورج کو نہیں دیکھتا، اِس لئے اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دُوسری دُنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ رات کی زندگی گویا کرۂ ماہتاب میں جاکر زندگی بسر کرنے سے معلوم ہوتی ہے۔ چاہو تجربہ کرکے دیکھ لو۔"

اِسی عرصہ میں اس نے الفرڈ تھیٹر کی ایکٹرسوں میں سے

ایک سے دوستی پیدا کرلی، اور ایک دن اسکے ایک واقعہ کو ایک مبہم واقعہ کے طور پر مجھ سے بیان کرنے لگا۔ اسکی کسی عورت سے دوستی ہوتی، مجھ سے چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ ایکٹرس کے متعلق ایک دن مجھ سے کہنے لگا "گوہر جان" کس قدر بھولی لڑکی ہے۔ ہرگز خیال میں نہیں آسکتا کہ کس طرح یہ بھولی بھالی لڑکی، اسٹیج پر آکر شیطانی مسکراہٹ سے مٹک مٹک کے، چمک چمک کے سینہ کو ابھار ابھار کے تمام تماشہ دیکھنے والی خلقت کی حریص نظروں کے سامنے عشوہ فروشی کرتی ہے۔ ایسی بچپن کی سی باتیں کرتی ہی، کہ دل بے اختیار قربان ہونے کو چاہتا ہے۔ کمپنی کے ساتھ ہندوستان کے سارے شہروں میں پھر آئی ہے لیکن یہ خیال کرتی ہے کہ یہ سارے شہر ایک خط مستقیم میں، گویا ایک تار کے اوپر سلسلہ بسلسلہ بندھے ہوئے ہیں۔ ایک دن مجھ سے

پوچھنے لگی: "بمبئی کے بعد کونسا شہر آتا ہے۔ اوّل مَیں نے اس سوال کو سمجھا نہیں؛ لیکن اُس نے خود ہی، ایک کے بعد ایک دیا سلائی رکھ کے مجھے سمجھانا اور گنانا شروع کیا: بمبئی کے بعد دِلّی، دِلّی سے لکھنؤ، پھر بنارس، پھر امرتسر پھر لاہور، پھر حیدرآباد، پھر کلکتہ آتا ہے؛ اور اس بات سے جھلّا کے کہ مَیں اتنی دیر میں سمجھتا ہوں، مجھی سے پُوچھنے لگی: "اسکے بعد؟" اس وقت میں بھی دیا سلائیاں رکھ کے گنانے لگا: مدارس، مدارس کے بعد پشاور، پھر بنگلور، پھر رنگون، پھر احمدآباد، پھر ٹمبکٹو۔ یہ آخری نام سُن کے، مارے خوشی کے اُچھل پڑی، ٹمبکٹو، ٹمبکٹو خوب نام ہے۔ وہاں ناٹک بھی ہوتا ہے کہ نہیں۔ اگر کہیں مَیں کہتا کہ ہاں ہوتا ہے تو وُہ شاید وہاں تک جاتی۔ مگر کہیں دفع بھی ہو کیونکہ میری طبیعت اس لڑکی سے بھر گئی۔

فرامرز کی طبیعت ہر کسی سے بھر جاتی تھی۔ یہ لڑکی بمبئی سے چلی گئی، شاید ٹمبکٹو کا ناٹک دیکھنے گئی ہو گی، کہ ہیں نے سُنا کہ فرامرز نے کمبا لاہل میں اِک جرمن گورنس سے راہ ورسم پیدا کی ہے۔ اس زمانہ میں مجھ سے اِک دفعہ ملتے ہی اس گورنس کے متعلق اپنی رائے بیان کرنے لگا:

اُس قدر کھاتی ہے، اس قدر کھاتی ہے کہ نفرت ہو گئی، اگر تم کہیں اُسے اپنے ہونٹوں اور دانتوں سے ادھ کچے بیف سٹیک کا خون پونچھتے دیکھو تو..... اُف" حضرت کا عشق بہت سے بہت اِک مہینہ رہتا تھا۔ اس ایک مہینہ میں نہایت بے پروا اور خوش خوش نظر آتا کہ یکایک پھر اس پر تھکن اور غمگینی چھا جاتی، مگر ہر وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک خیال، جو اس کے دِل میں ایسا بیٹھ گیا ہے کہ ہٹائے نہیں ہٹتا، اُسی کا تعاقب کرتا پھرتا ہے۔ مگر وہ ہاتھ نہیں لگتا۔

اُس کے اِن تمام کھیل تماشوں، اِن تمام دِل بستگیوں، اور پھر ان تمام کسالتوں میں یہ صاف نظر آتا تھا کہ وہ اس پہلے اُس سچّے عشق کی جراحت کے لئے ایک غیر قابل حصول دَوا تلاش کرتا پھرتا ہے۔ ہر نئی دِل بستگی ختم ہونے کے بعد کسی نہ کسی بہانے سے اُس پہلے عشق کی بحث چھیڑ دیتا۔

اِک دن اتوار کا دِن تھا، وُہ گاڑی پر میرے ہاں آیا، اور باہر سے یہ کہلا کے بھیجا "کہ جلد کپڑے پہن کے آیئے، مَیں گاڑی میں انتظار کر رہا ہُوں" مجھے چوپاٹی پر لیجانا چاہتا تھا؛ یہ بھی اِک وُہ دِن تھا جب کہ اُس کے نت نئے تعلقوں میں سے ایک تعلق ختم ہُوا تھا، آجکل وُہ تھیٹر کی مخلوق، اور وہیں کی سڑکوں میں چکر لگایا کرتا تھا۔ گرانٹ روڈ چھوڑ کے چوپاٹی پر جانے کے ارادے پر مَیں نے تھوڑا سا مسرّت آمیز تعجب ظاہر کیا۔ وُہ کہنے لگا: "ہاں میں وہاں کی تمام ناپاکیوں

اور ناپاکیوں سے بیزار ہوگیا۔ اب میں ایک ایسی صورت دیکھنے کے لئے محتاج ہوں کہ کچھ تو مجھے پاک کرے، ایک ایسی صورت جو مجسم آسمانی شعر ہو"۔

آج ایک پارسی تہوار تھا، سمندر کے کنارے شام کے قریب پارسیوں کا نظر فریب مجمع تھا؛ اُنکی زنگارنگ کی ساڑھیاں، جنہیں بنگالنیں، مرہٹنیں سب ہی پہنتی ہیں مگر جنہیں حسن طبیعت کے ساتھ پہننا صرف یہ ہی جانتی ہیں۔ ہوائیں لہرا رہی تھیں، لڑکیاں، بال کھولے، باندھے طرح طرح کی پھولدار ٹوپیاں پہنے سمندر کے کنارے گھونگے اور سیپیاں جمع کرتی تھیں۔ آسمان پر قوس قزح نکلی ہوئی تھی جسکے کنارے سمندر سے آکر ملتے معلوم ہوتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوس قزح کی اقلیم ہیں، قوس قزح کی پریاں پھر رہی ہیں، اور قوس قزح کی ملکہ کا یہ حکم ہے کہ جیسے رنگ

کی لطافت سے لگاؤ نہ ہو وہ یہاں نہ آئے: مسلمان عورتیں یہاں نہ تھیں۔ وُہ پھولوں کے درمیان، سمندر کے کنارے آبشاروں کے قریب، سبزے کے اوپر، موسیقی سے بھری فضا میں کب ہوتی ہیں؟

ہم دونوں نے تھوڑی دیر خاموشی سے ایک چکر لگائے، وُہ کبھی گہری نظریں ڈالتا، کبھی ایک طرف کو سر جھکاتا، گویا کسی خیال میں غرق تھا، یکایک کہنے لگا: ہاں یہ چہرہ بیشک ایک لاہوتی شعر ہے، بشرطیکہ اس چہرے کا بھولاپن، فرشتہ پن قائم رہے اور اُس دوسری میں دیکھو، پلکیں کس بلا کی ہیں۔ تم نے کبھی خیال کیا ہے بعض اوقات ایک مبہم سا نظر آتا ہے اور ایک دم نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ پھر دُوسرا چہرہ نظر پڑتا ہے: اُس کے نقش جم رہے ہوتے ہیں، اُس کی تصویر لوحِ دل پر کھنچی ہوتی ہے، کہ یکایک ایک خیالِ موہوم کی طرح وُہ بھی نظر سے

دُور ہو جاتی ہی. غرضیکہ یہ چہرے جو پُورے نہیں دیکھے جاتے، پُوری دیکھے جانے سے میرا مطلب دِل بھر کے نہیں دیکھے جانے، اِن باصرہ فریب مناظر ہیں دماغ کے اندر ایک خواب کی سی کیفیت لاکر گڑبڑ پیدا کر دیتے ہیں. یہانتک کہ یہ چہرے رِل مِلا کے، ایک کا تبسّم، دوسری کی نظر تیسری کی ادا، چوتھی کے بال ایک پُر لُطف مجمُوعہ دماغ میں پیدا کر دیتے ہیں، پھر اِس طرح سے بنا ہُوا مجمُوعہ......" یہانتک کہہ کے یکایک ٹھٹکا، اور ٹھٹک کے ایک سامنے سے گذرنے والی فٹن پر نظر ڈالی. ہاں بیچارہ تمام اِس طرح سے بنے ہُوئے مجموعوں کے ذریعہ سے اُسے ہی، اُس پہلے عشق ہی کی جستجو کرتا تھا. جانے میرے دِل میں یہ خیال کیسے آیا؟ شاید اس اُمّید پر کہ اُس بیماری کی جسے اس ملاقات میں اُس نے بصراحت ظاہر کیا تھا، یہ دَوا ہو گی میں نے کہا: تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" اُس نے مجھ پر ایک ایسی نظر ڈالی گویا

اُس سے کوئی بڑی حیرت انگیز بات کہی گئی، پھر ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا: "دیکھو یہ فکر فوراً قابلِ عمل فکر تو نہیں"۔ مَیں نے اس ہنسی کے جواب کا کچھ جواب نہیں دیا تھا، وُہ تھوڑی دیر چُپ رہا اور سامنے سے گذرنے والی گاڑیوں پر نظر ڈالتا رہا، پھر یکایک میری طرف سر پھیر کے کہنے لگا: "لیکن بھائی جان مَیں کس کے ساتھ شادی کروں؟"

مَیں اس عرصہ میں اس بات کو بھول بھی گیا تھا، نہ معلوم فعتاً اُس کا خیال اس بات کی طرف کس طرح گیا، مَیں فوراً جواب نہ دے سکا لیکن اس نے جواب کی حاجت ہی نہ چھوڑی، کہنے لگا: "اور کس لئے شادی کروں بیاہ شادی سے انسان ایک نہایت اچھی عورت اور شاید نہایت خوبصورت بچے حاصل کرسکتا ہے۔ مگر اس کے سوا؟ اِسکے سوا اور کیا چاہتے ہو۔ اسمیں بھی ایک شعریت ہے، بلکہ اصلی شعر حیات اسی میں ہے۔ مگر اسکو محسوس کرنے کیلئے اسکا لطف اُٹھانے کے

قلب کو بہت سی چیزوں سے خالی کرنا ضروری ہوگا۔"

وُہ رُکا پھر اُس نے جواب میں کہا: "مَیں اپنے دِل کو خالی کرنا نہیں بلکہ مختلف چیزوں سے اس قدر بھرنا ٹھوسنا چاہتا ہوں کہ آخر تاب نہ لا کر پھٹ جائے" پھر رکا۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا، اور پھر گذرنے والی گاڑیوں پر نظر ڈالتا رہا، اس کے بعد ایک شدید حرکت کے ساتھ میری طرف مڑ کے، اُس نے اوّل دفعہ مجھ سے اعتراف کیا "کبھی یہ خیال کرتا ہُوں کہ اس وقت مَیں نے بڑی غلطی کی: شاید اگر اُس کے ساتھ شادی کر لیتا تو ممکن ہے کہ اس اضطراب دل کو سکون ملتا۔ آہ تم کیا جانو کہ مجھے کبھی کیسا سخت اضطراب ہوتا ہے!"

آخر اس بدبخت شخص نے، جس کے مُنہ سے یہ اظہارِ حقیقت نکل آیا تھا، پہلے آہستہ سے اپنے ہاتھوں میں میرے ہاتھ کو لے لیا، اور پھر گویا اپنے اضطراب کے درجہ شدّت کو جتانے

کے لئے اپنی پوری قوت سے میرے ہاتھ کو دبا ڈالا۔ اُس کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ کیوں ازدواج کا ذکر اُس سے کیا کیونکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس ذکر سے میں نے اُس کے کیسے حساس نُقطۂ قلب کو ٹھیس لگائی، گویا میں نے اپنی انگلی تلاش کر کے اُس کے زخم پر رکھدی اور ایسی ٹھیس لگائی جس سے اُس کو جتنی تکلیف پہنچ سکتی تھی پہنچ گئی۔

غالباً یہ سیر آخری سیر تھی، اس کے بعد میں بمبئی سے چلا آیا، کہ قسمت نے اس مرتبہ پھر اس نوجوان کو میری راہ میں، قلابہ اسٹیشن پر، مگر کس قدر تبدیل شدہ حالت میں لا ڈالا۔

آخر جب اُس نے سگرٹ کی راکھ گرا کے سر اُٹھایا تو میں نے "آپ" کو علیحدہ رکھ کے پُوچھا "اُس واقعہ کے بعد بمبئی آنے کا

ذکر تم نے کیا تھا، وہ کونسا واقعہ تھا"؟

اُس نے اس دفعہ گویا گہرائیوں میں سے عالم اسرار کے اعماق میں سے نکلنے والی نظر سے مجھے ٹکٹکی باندھ کے دیکھا۔ اس نظر میں ایک ایسی غیر معمولی چیز تھی کہ اس نوجوان سے جسے میں برسوں سے جانتا، اور جس سے محبّت کرتا تھا، میرے دل میں ایک لرزہ بارد پیدا ہو گیا۔ اس سیکنڈ میں اس شخص کے اور میرے درمیان۔ اس کا سبب، میں نہیں جانتا۔ ایک ہوائے بارد و منجمد مجھے آنے لگی، اور مجھے ٹھٹھرانے لگی۔ وہ اپنی عجب نظر سے ٹکٹکی باندھے رہا اور میرے سوال کا جواب تو نہ دیا، بلکہ خود مجھ سے پوچھنے لگا: "آج شام کو کہیں تمہیں کچھ کام تو نہیں، کسی سے وعدہ تو نہیں"؟

میرے جواب نفی پر، اُس نے تھوڑا سا تردد کیا، آخر کہنے لگا:—

"تو آج شام میں تمہیں نہیں چھوڑنے کا، آج رات کھانا میرے ہی ساتھ کھانا" اور جب اُس نے یہ دیکھا کہ مجھے جواب موافق کے دینے میں تھوڑا سا تردّد ہے، تو نہایت درجہ صمیمیت اور عاجزی کی آواز سے کہنے لگا "میں التجا کرتا ہُوں"۔

آج کی شام، جو وقت فرامرز کے ہاں گذرا وُہ میری زندگی کے مستثنیٰ گھنٹوں میں سے ہے۔ وُہ مجھے اپنے ساتھ بند ورہ لے گیا، اور شام تک درختوں میں چُپ چاپ کبھی کسی منظر کی طرف اشارہ کر کے کبھی کسی معمولی سے مضمون کے متعلق ایک آدھ بے ربط لفظ کہہ کے، مجھے اِدھر اُدھر ٹہلاتا رہا۔ میں بھی حقیقت یہ ہے کہ اس سکوت سے خوش تھا۔ آخر گھر لَوٹ کے کہنے لگا: "بہت بھوک لگی ہے، کھانا کھانا چاہیئے" میں اِک غیر معلوم سبب سے گھبرایا ہوا تھا،

ہم نے کھانا کھایا جیسے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد اپنے خاص کمرے میں لے گیا اور کہنے لگا: "یہ میرا کمرہ ہے"۔

یہاں تاریکی تھی۔ داخل ہوتے وقت، کثیف تاریکی کی وجہ سے مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اس وقت۔ شاید اس تاریکی کے سبب سے مجھ پر اک ڈر طاری تھا کہ اُس پر میں غالب نہیں ہوسکتا تھا۔ آخر مجھے دیا سلائی کی رگڑ کی آواز آئی۔ اُس روشنی میں جو یکایک میری آنکھوں میں آئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی لرزہ دار شکل مبہم، ہاتھ بڑھا کے دیا سلائی سے موم بتّی جلا رہی ہے۔ بتّی سے ایک سُرخ غبارِ روشنی نکلنا شروع ہوا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بتّی اس کمرے کے کثیف ظلمت کو زائل کرنے کے لئے اپنے میں کافی قوت نہیں پاتی، مگر اپنی کوشش کے پورے حملے کر رہی ہے۔ اور اس وقت کچھ تاریک کچھ روشن حالت میں میں نے دنیا کا سب سے عجیب

اک کمرہ دیکھا : ساری دیواروں پر سُرخ کاغذ لپٹا ہُوا تھا، اور ایک غیر منتظم ہوس کے ساتھ ، دیواروں پر طرح طرح کی تصویریں چینی کی رکابیاں جڑی ہُوئی تھیں ، بریکٹوں پر کہیں تاج محل کی سنگ مرمر سے بنائی ہوئی نقل، کہیں سنگِ مرمر کے بائبل کے بُت، کہیں پنکھے ۔ غرضیکہ سیکڑوں طرح کی ، اور سیکڑوں رنگوں کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بکھری ہُوئی تھیں : مثلاً ایک چینی کی رکابی تھی جس پر ایک تصویر منقش تھی : ایک گھنے درختوں کا جنگل ہے، اس میں ایک بارہ سنگھا ہے جس کے سینگ ایک درخت کی شاخ میں اُلجھ گئے ہیں اور وہ اُنہیں چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے ۔ اس رکابی کے پاس ہی ایک بریکٹ پر، ایک لکڑی کے بنے ہُوئے چھوٹے سے مندر میں (جس کے اوپر سیپیاں چپکی ہُوئی تھیں) گنیش جی مہاراج کا بت رکھا ہُوا تھا ۔ ایک اور تصویر تھی جس میں ایک وحشی صورت

لڑکی بیٹھی تھی جس کا آدھا دھڑ سیاہ زمین میں غائب تھا، اور
بالوں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ تصویر کے
نیچے دو جاپانی پنکھوں کو کھول کے اور دیوار میں گاڑ کے
ایک عظیم تیتری کی شکل بنائی گئی تھی۔ غرضیکہ ان دیوارو
میں کوئی کونا کھدرا ایسا نہ تھا کہ اُس میں فرامرز کے فکرِ عجیب نے
ایک ہوسِ مجنونانہ کے ساتھ اپنا آشیانہ نہ بنایا ہو۔
ان سب کے بعد ایک کونے میں لکھنے پڑھنے کی میز،
اُس کے پاس ایک چھوٹی سی گول میز، اور ایک گھومنے
والی کتابوں کی الماری۔ اُنکے اوپر مختلف گلاس، کاسے
البم، کاغذ، کتابیں تھیں۔ زمین پر قالین کے اوپر بھی چھوٹی
بڑی کتابیں کھلی اور بند پڑی ہوئی تھیں۔ پاس ہی ایک
چیتے کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ اور اُس پر مختلف چیزیں
بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ میز پر ایک گلدان میں

ایک عجیب سوکھا پودا اگا ہوا تھا جس کے پتے چھتری کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ اس تمام گڑبڑ پر اگر سو دفعہ نظر ڈالی جائے تو ہر دفعہ اک نئی چیز نظر آئے، چھوٹی چھوٹی لاتعداد چیزیں تھیں جنکے وہاں ہونے کا کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا تھا، اور پھر ان سب عجیب چیزوں کو ایک لرزش حیات دینے والی موم بتی تھی جس میں سے مختصر سی سُرخی مائل روشنی نکل رہی تھی۔

مَیں ایک آرام کرسی میں بیٹھ گیا، وُہ میرے مقابل مگر کچھ فاصلہ پر، کھڑکی کے پاس ایک چوکی پر بیٹھا، اور بلا کسی تمہید کے یکایک، چار گھنٹے ڈاول کی گفتگو پر پلیٹ کے خشک آواز سے کہنے لگا: "اس واقعہ کی تمہیں خبر نہیں؟ تو مَیں تمہیں بتاتا ہوں، میرے ساتھ اُس نے بیوفائی کی۔"

میری زبان سے بے اختیار "کس نے" نکلا۔

فرامرز نے فوراً جواب دیا: "اُس نے"

اُس وقت میں اُسے دُور سے، اس مختصر روشنی میں جس کے ساتھ کھڑکی سے داخل ہو کر اب چاند کی روشنی بھی شامل ہو گئی تھی، ایک خیال، ایک شکل مبہم کی طرح دیکھ رہا تھا۔ اس روشنی میں وُہ زیادہ ضعیف، زیادہ زرد نظر آتا تھا۔ اور اس کی اسرار انگیز آنکھوں میں، جو مجھ پر گویا برف باری کر رہی تھیں اور زیادہ وحشت معلوم ہوتی تھی۔ مجھ پر اپنی باتوں کا اثر معلوم کرنے کے لئے نظر ڈال رہا تھا۔ یکایک اپنی جگہ سے اُٹھا، اور میرے سامنے آیا۔ مَیں پہلے ہی ہمدردی کے ساتھ سُن رہا تھا، کہ اُس نے بھرائی ہُوئی آواز سے کہنا شروع کیا:۔

"مَیں سچ کہتا ہُوں میں بس اس کی توقع نہ رکھتا تھا۔ اس شام کو جب کہ آخری دفعہ ہم تم دونوں چوپاٹی پر تھے، وُہ

بھی وہاں تھی ۔ اور سچ کہوں؟ مَیں اُسے ہی دیکھنے وہاں
گیا تھا ۔ کیونکہ ایک دن خواہ مخواہ میرے دِل میں ایک
شُبہہ پیدا ہوگیا تھا: اگر کہیں بیوفائی کرتی ہو تو؟ مَیں نے
ہر چیز کا تحمل کیا تھا، لیکن یہ خیال کہ وُہ اُس پاکیزہ عشق کی
یاد میں صادق نہیں ہے اور میرے علاوہ کسی اَور کو دل میں
رکھتی ہے، مجھے مارے ڈالتا تھا ۔ اُس نے بیاہ کیا، یہ
اُس کا حق تھا ۔ ہے نا؟ مگر اُس عشق کی یاد سے بیوفائی کرنے
کا وُہ حق نہیں رکھتی تھی ۔ اُس دن مَیں نے اُسے ہنستے دیکھا
ایک نوجوان کے ساتھ ہنس رہی تھی، یعنی کہ میرے ساتھ
بیوفائی کر رہی تھی، اور مجھے یقین ہے کہ صرف مجھے مار ڈالنے
کے لئے ایسا کر رہی تھی ۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اُس دن مَیں نے
کیسی طاقت فرسا کوشش سے اپنی طبیعت کو روکا کہ دَوڑ کے
اُس کی گاڑی پر چڑھ کے اُس کا مُنہ نہ نوچ لُوں؟

یہ کہتے وقت کانپ رہا ہے، گویا اس بیوفائی کے وہم خیال سے دست و گریبان ہونا چاہتا ہے۔

میں نے کہا: "لیکن صرف اُسے ہنستا دیکھنا کافی سند نہیں، خاصکر جبکہ تمہارا اور اُس کا بات چیت کا بھی تعلق نہیں رہا تھا۔ علاوہ ازیں تم بھی ....." اُس نے میری بات پوری نہ ہونے دی، میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اور نرم آواز سے گویا مجھے اپنا ہم خیال بنانا چاہتا ہے کہنے لگا: "نہیں نہیں، وہ میرے ساتھ بیوفائی کرتی ہے، یہ محقق ہے، تم بھی اُسے یقین کرتے ہو، تم بھی اُسکی دہشت تاثیر، مجھے مار ڈالنے والی قوت سے واقف ہو۔"

واقف ہی سمجھنا چاہئے تھا۔ کیا بحث کرتا۔ لازم یہی تھا کہ اعتراض نہ کروں۔

کہنے لگا: "ابھی تم میری ہنسی اُڑانا چاہتے تھے، یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے بھی تو اُس کے ساتھ بیوفائی کی؟ ہے نا؟ مگر یقین مانو کہ وُہ تمام عورتیں جن سے میں ملتا تھا، وُہ دل بہلاوے تھے، وُہ اس عذاب اور اضطراب کے گھٹانے کے لئے کھلونے تھے جو اُسے نہ بھولنے کی وجہ سے میرے دل کو پریشان کئے ہوئے تھا۔ میری زندگی میں اگر کھلونا کوئی چیز نہ تھی، تو صرف وُہ تھی۔ میں اُسے ہمیشہ صاف و پاک، ہمیشہ پُرشعر و خیال دیکھنا، اور ایک پاکیزہ افق سے اُٹھتے ہوئے سحابپاروں میں دفن کرنا چاہتا تھا۔"

پھر ایک ٹھنڈا سانس بھر کے کہنے لگا: "آہ یہ عورتیں! مجھے اُن کا کیسا تلخ تجربہ ہوا ہے جانتے ہو یہ کیا ہیں؟ یہ پھول ہیں جنکی دُور ہی سے سیر کرنی چاہیئے؛ کیونکہ جو چیزیں ان میں ڈھونڈی جاتی ہیں، وُہ اُن میں نہیں ہوتیں۔ عورت،

ایک رنگ ہی کہ اُسے دیکھتے ہو تو تمہیں مست و مدہوش کرتا ہی
مگر یہ رنگ اس لئے بنا ہے کہ صرف دُور سے دیکھا جائے ۔
اُسے چھونا مت ، کیونکہ چھوتے ہی اُڑ جائیگا ، اور ایک پژمردہ
داغ کے سوا کچھ باقی نہ رہیگا ۔ یا عورت ، ایک روشنی ہی نظر فریب
و دلنواز ، ایک خندۂ ضیا ہے اُس کی طرف ہاتھ نہ بڑھانا ، کیونکہ
روشنی غائب ہو جائیگی ، اور خندۂ ضیا کے بدلے ، تاریکی
رہجائیگی ۔ اُف ! عورت سے توقع ہوتی ہے قصیدہ کی ،
ملتا ہے مرثیہ ، اُمید ہوتی ہے اُن ہاتھوں سے تھپک کی ،
دیتے ہیں زخم ۔ غضب یہ کہ یہ زخم بالکل باریک خط سے ہوتے
ہیں ، فوراً ابھر جاتے معلوم ہوتے ہیں ، مگر جن ناخنوں سے
یہ زخم بنتے ہیں ، اس میں ایک قطرۂ زہر ہوتا ہے ، وہ اُس
زخم میں نفوذ کر جاتا ہے ، اور آہستہ آہستہ ، اُس آگ کی طرح
جو کرۂ زمین کے پیٹ میں ہے اور وہاں دھاتوں کو پگھلا

رہی ہے۔ یہ بھی تمہارے خُون میں گھُس جاتا ہے، اور جہاں گھُستا ہے، اُسے مسموم کرتا ہے، ہر قطرۂ خون میں ایک قطرۂ مُہلک اور بڑھاتا ہے، یہانتک کہ تمہاری زندگی زہریلی ہوجاتی ہے۔ تم ہنستے ہوتے ہو، تمہیں کچھ خبر نہیں ہوتی، وہ اپنے فرضِ تخریبیہ کو پُورا کرتا ہوتا ہے۔ تم اس وہم میں ہو کہ تم زندگی بسر کر رہے ہو۔ وُہ تمہیں مار رہا ہوتا ہے۔ ثانیہ بثانیہ تمہاری زندگی میں سے ایک ایک ذرہ لیکر تمہیں برباد کرتا ہے، اُکھاڑتا ہے، جلاتا ہے"!

اب اس کی آنکھوں میں ایک کیفیت۔ کس لفظ سے تعبیر دوں! ایک جانکنی کی سی کیفیت پیدا ہورہی تھی، اور گویا اُس سے ایک بحرِ حزیں کی سیاہ مَوجیں جوش مار رہی تھیں۔ مَیں اس کی باتوں میں ذرا سا ہرج نہ کرنا چاہتا تھا، صاف تو یُوں ہے کہ اس غیر معمولی زمین میں اس غیر معمولی آدمی کے ساتھ بحث کرنے کی ہمّت

نہ رکھتا تھا، اور ان آنکھوں کے مقابلہ میں میرے دل میں کبھی ڈر، کبھی رحم پیدا ہوتا تھا، اور میں اپنے سیگرٹ کے دھوئیں کی آڑ میں اُن آنکھوں سے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا، صرف اُس کی باتیں سُننا چاہتا تھا۔ وُہ یکایک کھڑا ہو گیا۔ اب اُسکی طبیعت میں ایک ہیجان تھا؛ کہنے لگا:

"تم سے ایک بات کہوں؟ صرف تم سے کہونگا، کیونکہ تم سے کسی قسم کا اندیشہ یا خوف نہیں ہے۔ اس وقت تک میرے نزدیک دُنیا میں اگر ذی حیات کوئی چیز تھی تو صرف وُہ تھی۔ اُس کے بعد وُہ بھی مر گئی، میرے نزدیک بالکل مر گئی۔ اب...... دیکھو میں تمہیں بتلاؤں" یہ کہہ کے اُس نے میرا بازو پکڑ لیا، پھر ذرا سا جھک کے، سامنے کمرے کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا؛ اور کہنے لگا:

"دیکھتے ہو؟"

مجھے معلوم نہ تھا کہ وُہ کس چیز کو دکھانا چاہتا تھا، مَیں نے پُوچھا: "کسے"؟ وُہ ہاں ہُوں ہی سے اشارہ کرتا رہا۔ اور اس چیز کا نام لئے بغیر کہتا رہا:

"اُسے" آخر مجھے معلوم ہوا۔ جو چیز مجھے دکھائی جا رہی تھی، وُہ سنگِ مرمر کا ایک بُت تھا۔ ایک عُریاں لڑکی جو سنگِ مرمر کے ایک کُرہ پر ایک پاؤں سے کھڑی تھی، اور گویا اپنے تئیں سنبھالنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھوں کو اُٹھائے ہُوئے تھی۔ بُت تراشی کا ایک لطیف نمونہ!

فرامرز میرا شانہ پکڑے رہا، اور گویا اس لئے کہ کوئی اَور نہ سُن لے، آہستہ آہستہ کہنے کے لئے مجھ سے اور آملا اور مجھے سمجھانے لگا۔ کندھا پکڑے جانے کی تضئیق، میرے مُنہ پر اُس کے سانس کا لگنا مجھے گھبرا رہے تھے، وُہ سمجھا رہا تھا:

"ایک رات تھی، آج کی سی اُجالی رات نہیں، برسات کی گھپ اندھیری رات تھی۔ کتنا زمانہ ہوا مجھے یاد نہیں۔ اندھیری رات تھی، مَیں اسی کمرے میں تھا اور بتی نہیں جل رہی تھی۔ مَیں اس اندھیری رات میں بجلی کی سیر کر رہا تھا؛ مگر اُس کا خیال کر کر کے۔ تم نے تاڑوں پر کبھی بجلی کو بھی کوندتے دیکھا ہے۔ دیکھو اس کھڑکی سے وُہ دکھائی دیتے ہیں۔ اُس رات یہ تاڑ اور سیاہ معلوم ہوتے تھے۔ ایک سیاہی طاری تھی کہ بجلی اُس سے جنگ کر رہی تھی اور غائب ہو ہو جاتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اہرمن اپنے لمبے ہاتھوں کے لمبے ناخن بڑھا بڑھا کے، گاڑ گاڑ کے سینۂ ظلمت کو پھاڑ رہا ہے اور اس سے ایک لمحہ کے لئے ایک شلالۂ خون نکلتا ہے اور پھر سیاہی میں غائب ہو جاتا ہے۔ مَیں اس کی سیر کر رہا تھا، مگر خیال میں وہی تھی۔ یکایک مجھے کمرے میں ایک

حرکت سُنائی دی، اور کوئی سانس لیتا ہُوا معلوم ہُوا مَیں
مارے ڈر کے کانپا اور پھر جم کے رہ گیا۔"
اب میرے کندھوں کو اور دبا رہا ہے اور گویا کہیں وہ
بغل لے، مجھ سے اور آملا، اور ہاتھ سے اُسے دکھا کے
آہستہ آہستہ کہنے لگا :
"یہ تھی، ہاں یہی، اس گرہ کو اپنے پانوں تلے گڑھکاتی
میرے پاس آئی، اور آتے وقت، اُس تاریکی میں لرزتی ہوئی
اور قد میں بڑھتی جاتی تھی۔ اس کے بعد بجلی جو چمکی تو مَیں نے
اُسے صاف اور واضح طور پر دیکھا۔ میرے پاس آئی" ۔میرے
کندھوں کو اَور دبا رہا تھا، مجھ سے اَور مِلتا جاتا تھا ۔میرے
پاس آئی اور اپنے عریاں باہیں میرے گلے میں ڈال دیں،
تاڑوں کی تاریکی پر آہرمن اپنے چمکدار جنگلوں سے خون
گرا رہا تھا، کہ ہم ایک لمحہ میں ایک بوسہ محبت کے ساتھ

اِک عُمر بسر کر گئے۔ اب اس رات کے بعد، ہر رات تاریکی میں لرزتی لرزتی اپنے کرہ کو لڑھکاتی لڑھکاتی اور آگے آتے وقت قدمیں بڑھتی بڑھتی آتی ہی اور اپنی عریاں باہیں میرے گلے میں ڈال دیتی ہی، اور ایک لمحہ میں اُس لمحہ میں جو ایک عُمر کے طول کی برابر ہوتا ہی۔ مجھے وُہ لُطفِ زندگی دیتی ہی، جو کسی عورت میں نہیں رہا صاحب! اُس نے نہیں تُم نے میرے ساتھ بیوفائی کی ... یہ میرے ساتھ بیوفائی نہیں کر سکتی"!

اس تقریر کو ختم کر کے، فرمرز نے میرے کندھے چھوڑ دیئے۔ دو تین قدم پیچھے ہٹ کے کُرسی پر بیٹھ گیا، کُہنی گُھٹنوں پر رکھ کے سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں مجھے ایسا نظر آیا کہ رو رہا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا۔ ہائے بیچارے کا دماغ!

میں بمبئی سے چلا آیا، مگر فرامرز سے پھر ملنے کو دِل چاہتا ہی، خبر نہیں اُس نے اپنے اس پرستیدہ سنگین سے کبھی کہیں بیوفائی تو نہ دیکھی ❖